چاندنی کے سائے

مسعود جاوید

مکتبۂ دانش گنپت روڈ لاہور

چاندنی کے سائے

از

مسعود جاوید

مکتبۂ دانش فرنگ لاہور

قیمت
دو روپے

قیمت دو روپے ۲

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام محمد توقیر طاہر پرنٹر کے چھپوا کر
محمد توقیر طاہر پبلشر نے مکتبہ دانش لاہور سے شائع کی۔

خطوط وتراجم

خطوط ۱۱ —— تا —— ۱۵۶

تراجم ۱۵۷ —— تا —— ۱۵۷

اشارات

خطوط

خونِ حیات کے چند قطرے	وہ ایک لطیف "خیال" تھی —— سماج نے اُسے "عورت" کے لفظ میں بند کرنا چاہا "خیال" اُڑ گیا —— "لفظ" مر گیا"
جواب طلب اور جواب	"شعور و تحت الشعور کی ازلی کشمکش"
شباب و شعر	وہ صرف ایک "پجاری" تھا —— رسم و روایت نے اسے "شوہر" بنا دیا"
نگہت کے خطوط	"آتشکدۂ حیات میں عورت نے چلا کر پوچھا۔ مجھے جینے کا کوئی حق ہے کہ نہیں؟ —— ازدواجی معبد کے مہیب دیوتا نے راکھ

میں دبی ہوئی چنگاری کی طرف اشارہ
کیا ــــــ اور مسکرا دیا۔"

تراجم

"آعادہ"	"ان کی زندگی ایک قدیم تمثیل تھی جس میں رام کی بجائے "نفرت" — سیتا کی جگہ "محبت" اور راون کے بدلے چھوٹے انسانی علم و امتیازات نے اداکاری کی تھی"
مصور کا نظریۂ محبت	"وہ حسن جو پوری کائنات میں محدود نہ ہو سکے۔ صرف ایک تصویر میں کیسے سمٹ آتا؟ — مگر آہ — محبت!"

"فطرت نے محبت کو ایک مذہب بنایا
— تمدن نے اُسے فرصت کے
ایک لذیذ شغل میں تبدیل کر دیا!"

"دختر رز بدا"

خطوط

خونِ حیات کے چند قطرے

اُس نے مجھے متعدد خطوط لکھے اور ہر خط میں اپنی مجروح زندگی کی ایک نئی جھلک چھپا کر رکھ دی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھے خط ہی صرف اس لئے لکھتی تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی لذیذ سلیقہ تڑپنے کا اسے معلوم نہ تھا اور بغیر تڑپے وہ جینا نہ جانتی تھی۔

وہ شاعرہ تھی۔ ادیب تھی اور ایک خطرناک فلسفی۔ کیونکہ اس کے نظریاتِ حیات کسی اور کے فکر و خیال کے پروردہ نہ تھے بلکہ یہ سب کچھ اس نے خود اپنی زندگی کی بیہ رد ٹھوکروں سے سیکھا تھا۔—— اور مجھے یقین ہے کہ اگر اس کے حوصلۂ پرواز کے واسطے اس کے پر و بال اس قدر ناکافی نہ ہوتے تو ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح گرنے والی یہ بلند فطرت دوشیزہ

چنگاری بن کر اُڑ جاتی۔ اور موجودہ سماج کی خونیں تاریخ میں اس کا نام "طاہرہ" "قرۃ العین" یا "جون آف آرک" کی طرح روشن نظر آتا۔ میں نے اس کی ذہنیت کے بعض خطرات سے اس کے کردار کو حتی الامکان محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن عورت جذباتی پامالیوں کے بعد ایک گھائل ناگن بن جاتی ہے ـــــ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی زندگی کو سماج کے قہر ناک ناخداؤں نے کچھ اس طرح لوٹا تھا۔ گویا غریبوں کا کوئی خدا ہے ہی نہیں ـــــ اس طرح لٹ جانے کے بعد اگر اُس نے دنیا کے رسم پرستوں کے خلاف ایک ذہنی بغاوت کی تو کونسا جرم کیا۔ ایک ہی تو چیز تھی جو اب اس کے پاس رہ گئی تھی وہ اس کا بھی گلا گھونٹ ڈالتی۔ تو پھر اُسے خودکشی سے کون بچاتا؟

یوں تو معلوم نہیں میرے کتنے افسانے ایسے ہیں جو صرف اُس کی سرنیہٴ زندگی اور اس کے آتشیں مکتوبات کے تاثرات سے تخلیق ہوئے لیکن میں چاہتا تھا کہ ہو سکے تو اس کی روداد حیات کو پوری وضاحت کے ساتھ الفاظ میں محفوظ کردوں۔ اِس مقصد کے تحت خدا جانے میں نے کتنی مدت تک اس کی عمیق

فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اس کے مکتوبات سے اس کی زندگی کا ایک ذہنی خاکہ تیار کرتا رہا۔ مگر مجھے اعتراف ہے۔ کہ اس کے احساسات و خیالات میری فہم کے واسطے آج بھی اسی قدر مبہم و پیچیدہ ہیں۔ جتنے کہ میری اس جدوجہد سے پیشتر تھے۔

یہ میری اسی ناکامی کا نتیجہ ہے۔ کہ میں آج اس کے لطیف خطوط پیش کر رہا ہوں۔ جو یقیناً اشاعت اور منظر عام کیواسطے ہرگز نہیں لکھے گئے تھے —— یہ کوئی "افسانہ" نہیں —— وہ افسانہ جو حسن و محبت کی مفروضہ و فرسودہ کشمکش کا نام ہو کر رہ گیا ہے اور جس میں عشق کی طرح زندگی بھی اندھی نظر آتی ہے۔ نہیں یہ وہ افسانہ نہیں اور اگر آپ صرف اسی قسم کے افسانوں کو پسند کرتے ہیں۔ تو پھر ان سطور کو نہ پڑھئے۔ کیونکہ یہاں تو صرف سوزش ہی سوزش ہے —— آگ ہی آگ —— ان خطوط میں آپ کو ایک دکھیا دوشیزہ کی "زندگی" ملے گی —— "کہانی" نہیں؛ —— یہ اس کے جگر کے چند منتشر ٹکڑے ہیں۔ جن میں نہ کوئی ربط ہے نہ تسلسل —— اس کے خون حیات کے چند قطرے ہیں جو اس نے صرف میری نگاہوں

کے واسطے کاغذ پر ٹپکا دئے تھے۔ اگر آپ زندگی ——— حقیقی زندگی۔ کے اِس کھنڈر میں بکھرا ہوا کوئی "افسانہ" نہیں دیکھ سکتے۔ تو باقی تحریر کو بغیر پڑھے ورق الٹ دیجئے۔

میں نے اِن شہ پاروں میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں کیا اتنی جرأت ہی مجھ میں نہیں ہو سکی۔ ہاں صرف "اس" کا نام اور چند مقامات کو بدل دیا ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ یہ بھی نہ ہوتا مگر کیا کروں اِس کا حق مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔

دہلی ۴ جنوری ۱۹۳۹ء

شعرمیت نواز دوست!

دیکھ رہے ہو۔ عمر کا ایک اور سال ہم سے رخصت ہو گیا ہے ——— ہمیں روتا ہوا چھوڑ کر ——— ہمارے اشکوں پر مسکراتا ہوا ——— اور ہستی کے نہ بھرنے والے زخموں پر نمک چھڑکتا ہوا ——— جانتے ہو یہ مجھے کیا دے گیا ہے؟ کرب خمار اور تلخی لذت !! ——— یا پھر لبوں پر آ کر رک جانے والی چند آہیں ——— اب نیا سال شروع ہے اور دیکھئے! کتنے زخموں کا اضافہ اور ہوتا ہے!

یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ مجھے اپنی تباہیوں کا ماتم بھی نہیں کرنے دیتے؟ دیکھتے نہیں میری روداد آرزو کس طرح پارہ پارہ کر دی گئی ہے؟ میرے ارادِ دل کو کس بے رحم انداز سے کچل دیا گیا ہے۔ اور تم ہو کہ مجھے اپنی پامالیوں پر چند آنسو بھی نہیں بہانے دیتے!! تم نے تو خود کہا تھا اپنی حسرت کی تمام تر بیتابیوں کے ساتھ کہ ؎

شدّتِ غم کسی برباد کے آنسو تو نہ چھین!
یہ شرارے ہی تو کچھ آگ بجھا دیتے ہیں!

پھر یہ آج کونسا جذبہ مضطرب ہے۔ کہ مجھے خود ہی اس حقیقت کے خلاف جہاد کرنے پر مجبور کرتے ہو؟ —— پوچھتے ہو —— کہاں کی داستان کہنے لگی؟ —— مجھے یقین ہے تمہارا تمام نفسیاتی مطالعہ بھی اس کے جواب سے قاصر رہے گا۔ افسوس تم میری اس خلش کو آج تک بھی نہ سمجھ سکے اور میرے درد کی ان شیریں ٹیسوں کو آج تک نہ پہچان سکے۔ اس کا سبب جو کچھ ہو بس تو یہ سمجھتی ہوں کہ تم نے آج تک صرف سطحی نظر سے مجھے دیکھا ہے اور اسی لئے مجھے بھی "سبکسارانِ ساحلہا" میں شامل کر رہے ہو۔ اُف تم نہیں جانتے یہاں دو نوں چیزیں ہیں

"بربادی کا شعور دہوش بھی" اور" تباہی کو بھول جانے کی مجبوریاں" بھی! ——— کسی غریب کی اجڑی ہوئی وادیوں کا ہمدردانہ نظروں سے مطالعہ کرتے تو تمہیں اپنے متعلق یہ کہتے ہوئے یقیناً شرم آتی۔ کہ" تباہی ومعذوری کی یہ وہ منزلیں ہیں۔ جہاں خدا نہ کرے میرے بعد کوئی اور پہنچے"

زندگی اور محبت کا تصادم ——— اگر تم اس چیز کو بربادی ومعذوری سے تعبیر کرتے ہو تو لاؤ دنیا بھر کی بربادیاں اور معذوریاں سمیٹ کر مجھے عنایت کردو اور اس کے بدلے مجھ سے صرف میری ایک کاہش لے کر دنیا کو دے دو، پھر دیکھنا اعتراف شکست پر کون مجبور ہے اور شکستہ پائی کا شکوہ کس طرف سے ہوتا ہے؟ میرے لبوں پر تم اس وقت ڈھونڈھے سے بھی کوئی آہ نہ پاؤ گے اور بزم عالم صرف اس ایک کاہش کے سبب تمہیں طوفانِ اضطراب میں غلطاں نظر آئے گی۔ آخر تم میری کیفیات کو اس قدر سطحی نظروں سے دیکھنے کے عادی کیوں ہو؟

ذرا میری اور اپنی وابستگی کے پچھلے اوراق لوٹو اور غور سے سنو! ——— اس وقت تم بزعم خود" کامیاب"

تھے۔ اور تمہیں وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی تمناؤں کی انتہا ہی یہ ہے کہ "فنائے طلب" پیدا ہو جائے —— اس وقت کہ تمہاری دنیا عبارت تھی ایک فردوسی ماحول سے —— اس وقت کہ تم جس میخانے میں جھوم رہے تھے اس کے جھروکوں سے گردن باہر نکال کر "فردا" پر ایک سرسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرتے تھے —— اس وقت کہ تم نہ یہ جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے کہ تصویر حیات کا دوسرا رُخ کیا ہے؟ —— اس وقت کہ تمہارے دن نشاط و مستی کے ان لمحات سے معمور تھے جب کہ ساری دنیا یکسر ایک "تڑپ" بن کر رہ جاتی ہے —— اس وقت کہ تمہاری حسین راتیں مہتاب کی لطیف ضیا سے غسل کیا کرتی تھیں —— اس وقت کہ تمہاری رنگین شامیں کہکشانی فضاؤں سے تخلیق ہوتی تھیں —— اور اس وقت کہ تم سراسر "آہنگ و نغمۂ مستی" بن گئے تھے —— ہاں اس وقت بھی میں ناکام تھی۔ مجھ سے سب کچھ چھینا جا چکا تھا —— سب کچھ —— جینے کے طریقے بھی اور مر جانے کی سکت بھی! اب —— میری دنیا عبارت تھی غم و آلام سے —— میں مجبور تھی اپنے حال کے دلدوز حقائق پر آنسو بہانے اور

مستقبل کے نشیب و فراز پر غور کرنے کے لئے ——— مجھے سب کچھ دکھا دیا گیا تھا۔ رنگینیٔ جہاں کی حقیقتیں بھی اور "زندگی کے دوسرے افسانے" بھی ——— میرے اداس و مضمحل ایام تلخ ترین لمحات کا مجموعہ ہوتے تھے۔ میری خاموش راتیں زندگی کے زخموں سے چپکے چپکے کراہتی تھیں۔ میری ہر بے کیف شام خود میرے قلب و جگر کے خون سے سنواری جاتی تھی۔ میری زندگی اس وقت بھی کسی دیوانے کا خواب تھی اور مایوسیوں کے ویرانے میں اپنی اکھڑی ہوئی سانسیں گن رہی تھی اور میں اس وقت بھی خود اپنی صدائے شکست میں تحلیل ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ ہونے پر بھی میں اپنی سسکتی ہوئی زندگی گذارنے پر مجبور تھی اور اس کے لئے مجھے ضرورت تھی کسی رنگین سہارے یا کسی "فریب لذیذ" کی!! ——— عین اس دور میں تم نے مجھے ایک "کہانی" سنائی ——— کہانی تمہاری تھی مگر میرے زخمی دل و دماغ نے اُسے اپنا لیا۔ میں اس میں اس قدر گم ہو گئی کہ بیگانگی کا ہلکا سا احساس بھی ناگوار گذرنے لگا اور کہانی کے کرداروں کی خفیف سے خفیف تکلیف سے میری روح کو انتہائی اذیت ہونے لگی۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟

——— اپنی تباہیوں کو بھول جانے کی سعی کا ایک مستحسن فریب
——— اپنی کاہشوں کو فراموش کر دینے کی لاحاصل کوشش
——— مگر آہ ہ ——— دنیا اگر نظر انداز کر دینے کی چیز ہوتی۔ تو سب سے پہلے میں خود کو دنیا کا کامیاب ترین فرد کہتی۔ حقیقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو چھپائی نہیں جاسکتی اور ہوا بھی یہی ——— تمہاری عطا کردہ بہجت کوشیوں کا تصور بھے زیادہ دیر تک فریب نہ دے سکا۔ تم نے خود "اپنی کہانی" کے مزے مجھ سے چھیننے شروع کر دیئے۔ حتیٰ کہ تمہیں اُن کا تذکرہ بھی گوارا نہ رہا۔

اب میرے سامنے پھر وہی "زحمتِ ہستی" کا نہ مٹنے والا غم ہے اور وہی جذبِ جنوں کی طلب!! اُف! تم نے بیکار میرے زخمِ رشک" کو رسوا کیا اچھا ہوتا۔ کہ تم مجھے یوں نہ اپناتے اور میں یوں ہی "بیگانہ فریبِ دوستی" دنیا سے اُٹھ جاتی۔ اِس طرح مجھے کم از کم "دشواری راہ وستم ہمراہان" کا گلہ کرتے ہوئے بیکسی کی حسرت نہ اُٹھانی پڑتی!!

خیر جانے دو۔ کب تک عرض گرانی کئے جاؤں۔ چند منتشر جملوں اور مہمل الفاظ میں بہت کچھ کہہ چکی ہوں۔ اور اب

ڈرتی ہوں کہ تمہارے خطرناک سوالات سے اور تمہارے حسن برہمی کے لطیف انداز سے ....

.... تم پھر پوچھ بیٹھو گے کہ تیری ان کیفیتوں کی تہ میں کون کارفرما ہے؟" کبھی کہو گے "میں بے پئے جھومنے کا معترف نہیں" وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے ان کا جواب بھی پیشگی ہی سن لو ؎

دل کے خون کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار

"پاس بے رونقی دیدہ" اہم ہے ہم کو

ایک بار یہ شعر اور پڑھو اور خاموش ہو جاؤ کیونکہ "یہ وہ نہیں کہ اس کا تماشا کرے کوئی" تم سمجھو تو کسی ٹوٹے ہوئے ساز کے منتشر نغمے جب یوں چھیڑ دیئے جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے اس لئے اس کو یونہی پڑا رہنے دو خاموش چپ چاپ ——

—— اور حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں تک میرے ذاتی معاملات کا تعلق ہے میں تسلیم و رضا کی اس منزل میں ہوں جہاں انسان قنوطیت ہی سے نشاط روح حاصل کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کروں کہ میرے احساسات دوسروں کے درد کو اس طرح اپنا لیتے ہیں، کہ میری دشواریاں آسان ہو ہو کر پھر دشوار

ہونے لگتی ہیں۔ سکونِ یاس پھر کسی کھوئے ہوئے تصوّر سے شرماتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے اور غمِ امید پھر دل کی سوئی ہوئی دھڑکنوں کو گدگدانے لگتا ہے اسی لئے مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ دنیا اور اس کی تلخ حقیقتیں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں اور قدرت کا منشا بھی یہی ہے کہ انسانیت اپنے احساسات کی تمام تر بیداریوں کے ساتھ زندہ رہے۔ دنیا نے "تکمیل" اور اسرارِ حیات کی بے حجابی کا نام موت رکھ چھوڑا ہے۔ زندہ رہنا تو ہر کشمکش کو خود اپنے واسطے دعوت دینی ہوگی۔ اسی لئے میں تمہیں بار بار جھنجھوڑتی ہوں مجھے تمہارا سکون و سکوت گوارا نہیں اور یہی تمہارے اس سوال کا جواب ہے کہ "کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے" (غالب)

یہ صحیح ہے کہ تم مجھے اب تک نہیں بھولے۔ شاید اس لئے کہ یہ تمہاری قدرت کی بات ہی نہ تھی۔ پھر بھی تمہاری مسلسل خاموشیاں مجھے بدگمانی پر مجبور کرتی ہیں اور یہ محسوس ہو کر ہمت ٹوٹنے لگتی ہے کہ دنیا سے دردآشنائی اٹھ چکی ہے۔ تم میرے لئے شاید پہلے اور آخری انسان ہو جس نے میری خلش کو خلوص و محبت کی صداقتوں کے ساتھ سمجھانا چاہا ——

پھر مجھے تم سے کیوں نہ محبت ہو۔

اُف میں غریب و مفلس ہوں ـــــ اس قدر کہ تمہارے اس لگاؤ کا کوئی صلہ پیش نہیں کر سکتی۔ کاش اپنے احساسات کی طرف سے بھی میں اتنی ہی غریب ہوتی!!

پرسوں "........" کا سالنامہ آیا۔ تمہارا افسانہ "اس نے کہا تھا" ہی سب سے پہلے میرے لئے جاذب توجہ ہوا۔ اس وقت سے اب تک کئی بار پڑھ چکی ہوں۔ پھر بھی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ باغیانہ جذبات کو اس قدر حسین الفاظ کے پیکر میں منتقل کر دینا بے رحم سماج کو ـــ زہر کی قاتل گولیوں پر بہترین قسم کی شکر چڑھا کر کھلا دینا ہے۔ لاریب تمہاری سعی کامیاب ہے۔

یہاں کے حالات پوچھتے ہو؟ بس مختصر سمجھ لو۔ کہ جو لکھنے کی باتیں ہیں وہ بہت اچھی ہیں اور جو صرف کہنے کی باتیں ہیں ان کا لکھنا قطعاً نامناسب ہے۔ سُننا چاہتے ہو تو یہاں آ ؤ ـــــ میرے پاس۔

تمہاری شہناز

دہلی ۱۲/ فروری ۱۹۳۹ء

پیکرِ اخلاص!

سخت ترین طوفانِ باد و باراں کے وقت کسی ایسے شخص سے جو سمندر کے خوفناک تلاطم میں پھنسا ہوا زندگی اور موت کی جاں گسل ٹکریں سہہ رہا ہو اور جس کی امید حیات کا آخری فریب بھی اس سے چھن جانے والا ہو —— ہاں اگر ایسے انسان سے تم ساحل پر کھڑے ہو کر زندگی میں پیش آنے والے شکوے روا رکھ سکتے ہو تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ تم مجھ سے تاخیرِ جواب کی شکایت کیوں کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میں نے تمہارے دونوں ضروری خطوط کو نذرِ فراموشی کر دیا ہے۔ ہاں بجا ہے تمہارا یہ خیال بھی —— مگر جانتے ہو تم کہ میرے اس سکوت میں کتنے اضطراب نہاں تھے؟ اس خاموشی میں کس قدر آہ و زاری تلملا رہی تھی؟ اور اب بھی کیا کچھ نہیں ہے بس یوں سمجھ لو کہ روح ایک زبردست چیخ کے ساتھ میرے جسم سے پرواز کر جانے کی سعی کر رہی ہے اور میں اس کو اندر ہی اندر گھونٹ کر خاموش کر دینا چاہتی ہوں۔ —— قطعی خاموش —— اس طرح کہ صدا اسے شکستہ بھی کسی کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

میرے پاس اس تاخیر کے وجوہ بھی ہیں۔ مگر اوّل تو انھیں لکھنے کے لئے وقت اور ضبط کہاں سے لاؤں۔ پھر اگر کسی طرح لکھوں بھی تو تم "عذرِ گناہ" کہتے ہوئے زیرِ لب مسکرا دوگے نتیجہ یہی ہوگا کہ میرے جگر کا خون فراوانیِ درد سے درجوش میں آجائے گا؛ بہر حال اگر تمہارے نزدیک متذکرہ بالا نوعیت کا شکوہ جائز ہے تو مجھ سے وجوہ بھی پوچھ لینا۔ میں سمجھوں گی چند تمسوں کا اضافہ اور سہی۔ یا اگر تمہاری برہمی جذبۂ انتقام وسزا ہی کی تکمیل سے آسودہ ہونے کی متمنّی ہے تو مجھے اجازت دو کہ میں اپنی مہمل ہستی کی گرانباری کو جمنا کی ان اٹھلاتی ہوئی موجوں کے سپرد کردوں جو کسی "یادِ رفتہ" کی طرح مجھ ایسی بدنصیبوں کی تڑپ اور بے کلی کو ابدی تسکین دینے کی منتظر رہتی ہیں خیر اب تمہارے دونوں عتاب ناموں کا جواب دینے کی سعی کرتی ہوں۔

تم نے اپنے ذہن میں میری جو تصویر تیار کی ہے۔ اُس کا عنوان میرے نزدیک ایک مہمل استفہامیہ علامت (؟) کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ "عنوان تماشا" نہیں "بہ تماشا خوشتر" نظر آرہا ہے۔ اس کا سبب خواہ بقول تمہارے یہی

کیوں نہ ہو کہ میں نے "آج تک کبھی تمہارے کسی ایک پر شوق
کا جواب پوری وضاحت و بے تکلفی سے" نہیں دیا یا پھر ا
"مدعا" کو بیان کرنے سے محتاط رہی جس کو معلوم کرنے کے
تم آج تک بے چین رہے ہو۔ کاش تم اِس تصویر کا پس
دیکھنے اور سمجھنے کی زحمت برداشت کر لیتے مگر تم نے تو
کا موقعہ ہی نہیں آنے دیا۔ تمہارے دماغ میں تو بار بار یہ
گردش کرتا رہا کہ "شہناز" کس سے محبت کرتی ہے اور
کو وہ درد کس نے عطا کیا ہے۔ جو ایک خاص رومانی
میں پیدا ہو سکتا ہے —— وہ درد جو ایک بار پیدا
چپکے چپکے بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ درد والوں کی
دنیا ہی ایک خلش مستقل میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے
تم تو یہی سمجھتے رہے کہ شہناز کی تمام اندوہ گینیاں اسی در
کا نتیجہ ہیں۔ اُف! کاش ایسا ہی ہوتا اور بے رحم زمانہ
اسی رنگین جھولے میں جھولتا ہوا چھوڑ دیتا!! تم جس چیز
"احتیاط"۔ "مکروہ اخفا پسندی"۔ "بیگانہ وش رازدا
"منافقت" اور نہ جانے کیا کیا لکھا کرتے ہو وہ در ا
ایک معذوری ہے —— ہاں معذوری —— جو

تباہ کن ۔۔۔۔۔ جو میرے جیسے حالات میں ہر ایک انسان کو پیش آنی چاہئے ۔ گھبراؤ نہیں ۔ آج میں تمہیں سب کچھ سنا دونگی۔

میں نے بارہا سوچا کہ وہ کونسی داستان ہے جو مجھے تم کو سنانی باقی ہے مگر یقین کرو میں آج تک اس سوال کا کوئی صحیح جواب متعین نہیں کر سکی ۔ بہت کچھ غور کرنے پر اتنا کچھ سمجھ سکی ہوں کہ تمہارے خیال میں میرے پاس بھی ایک "افسانہ" ہے ۔ جو میں نے اب تک تمہیں نہیں سنایا اور اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ تم کہتے ہو ۔ میں اب تک تمہارے سامنے اپنے حقیقی مدّعا کو بیان کرنے سے محتاط رہی ہوں ۔ خیر آج مختصر طور پر اپنی دانست میں تمہارے تمام شکوے رفع کئے دیتی ہوں ۔ سنو ! اور میری اور اپنی حماقت پر سر دھنو !!

تم پوچھا کرتے ہو کیا تجھے کسی سے محبّت ہے ؟ میرا جواب ہے "ہاں" ۔۔۔۔ گیارہ سال سے ۔۔۔۔ تم ہنسو گے "گیارہ سال سے ؟ ؟" میرے سینے سے ایک دھیمی کراہ نکلنے لگی ۔۔۔۔ دل کہے گا ۔۔۔۔ "ہاں گیارہ سال سے میں اس کی محبت نہیں بلکہ پرستش کرتا آیا ہوں انتہائی خاموشی کے ساتھ" ۔۔۔۔ یاد رکھو کہ اس غریب دل کی دھڑکنوں نے اپنے مسجود محبّت

کو آج تک اس جذبۂ پرستاری کا ہلکا سا احساس بھی پیدا نہیں ہونے دیا۔ درآنحالیکہ اس کے مواقع بھی آئے۔ اس سے بہت پہلے "گزارے تھے خوشی کے چند لمحے" اور اب "انھیں کی یاد میری زندگی ہے"!

بچپن کا زمانہ تھا اور اسکول کی زندگی —— محسوسات و شعور کی ستم زائیوں سے دُور —— ہم دونوں کچھ عرصے تک ایک دوسرے سے قریب رہے۔ اس طرح کہ میں "ان" کو دیکھ کر ایک نامعلوم سا جذبۂ شرم و احتراز محسوس کرتی اور جب وہ نظروں سے ہٹ جاتے تو اتصال و قرب کی تمنا چٹکیاں لے لے کر بے چین بنا دیتی! بچپن کی حسین باتیں!! —— اب بھی اُن کے نقوش دماغ پر یوں ہی مرتسم ہیں۔ جیسے وہ نظارے ہنوز میری آنکھوں کے سامنے رقصاں ہوں" ان" کے سامنے پہنچ کر وہاں سے ایک دم بھاگ جانے کا جذبہ اپنے اندر پاتی —— نہ جانے کیوں؟

اُن سے جس قدر دُور ہونے کی سعی کرتی وہ اور بھی قریب آجاتے یا کر دیے جاتے دو سال اسی طرح ختم ہو گئے اور زندگی بھی ایک جدید دور میں پہنچ گئی۔ اس مدرسے کی آخری

س پاس کرنے کے بعد مجھے بڑے سکول میں داخل ہونا پڑا
ہاں میں ایک قسم کی افسردگی اپنے اندر محسوس کرنے لگی
د مکانی پیدا ہو جانے کے بعد بھی کہیں نہ کہیں وہ نظر آجاتے
—— اتفاقیہ طور پر —— میری حالت اب بھی وہی تھی
ے قریب میں اپنے دل میں وہی کیفیت محسوس کرتی تھی
میں ایک دم بھاگ جانے کا جذبہ شامل تھا پھر
دہ نہ ملتے تو طبیعت پر پژمردگی طاری رہتی۔ غالباً تین چار
ل ہوئے ہمارے ایک عزیز کی شادی تھی —— وہ اس شادی
ے اہتمام میں شریک تھے عملی طور پر۔ کاموں کے سلسلے میں بار
گھر میں آنا جانا پڑ رہا تھا۔ ایسے ہی ایک دفعہ وہ گھر میں آنے
لئے گھر میں داخل ہوتے تو میں سامنے تھی میں نے دیکھا
منے بالکل متصل۔ ایک قدم کے فاصلے پر ایک "گلاب" کھلا
ا ہے۔ میرے خیال و نظر روح اور جنت ایک قیامت
ستم کی طرح میرے سامنے تھی۔ میں سکتے کی حالت میں اسی
جگہ کھڑی رہ گئی۔ گرد و پیش کی نزاکت کا بھی احساس نہ رہا۔
تقریباً دو منٹ تک یہی کیفیت ان کی بھی رہی —— بیخودی
ر وارفتگی —— وہ مجھے بے اختیار اس طرح دیکھتے رہے

جیسے انھوں نے میری کھوئی کھوئی نگاہوں میں کوئی تحریر پڑھ لی ہے۔ اور اب کچھ سوچ رہے ہیں کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ میرا یہ اندازہ میرے تخیل کا فریب محض ہو ــــــ رنگین و لذیذ ــــــ مگر میں تو کچھ ایسا سمجھنے میں ہی لذت پاتی ہوں۔ میں اس دارفتگی سے چونکی تو صاحب خانہ چلا کر کہہ رہے تھے ــــــ "اندر کیوں نہیں آجاتے؟" اس اچانک طور پر ہوش میں آنے سے ہم اور بھی مدہوش ہو گئے اور بے اختیار اندر کی طرف بھاگے اس طرح کہ میں آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے ــــــ دل کے اضطراب اور سانس کی بے ربطی میں کچھ کمی ہوئی تو دیکھا وہاں کچھ بھی نہ تھا میں پردوں کے پیچھے تھی اور وہ جا چکے تھے۔

سمجھے تم یہ کونسا "گلاب" تھا؟ وہی میرے اُجڑے ہوئے چمن کا غیر فانی پھول ــــــ بس یہ آخری خواب تھا جو میں نے جاگتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد آج تک پھر میں کبھی ان کو نہیں دیکھ سکی ہوں۔ نہ صرف اس لئے کہ موقعہ نہیں ملا۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اب اس چیز کی تمنا ہی نہیں رہی۔ میرے لئے تو ان کا خیال و تصور ہی کافی ہے۔ پھر اگر اس سے

زاید کچھ اور چاہوں بھی تو میرے نزدیک یہ خود ان کی توہین ہی اس لئے کہ وہ ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھنے والی ہستی ہے جو مجھ جیسے بے بال و پر انسانوں سے بہت اونچا کہلاتا ہے "اونچا سمجھا جاتا ہے"۔

تم پوچھوگے ان کا نام کیا ہے؟ وہ کون ہیں؟ نام تو اُن کا مجھے بھی صحیح طور پر یاد نہیں جو کچھ یاد رہ گیا ہے وہ ایک مرتبہ تمہیں بتا چکی ہوں ــــــ کون ہیں؟ یہ لکھنے کی چیز نہیں صرف کہنے کی ہے۔ تم سوچوگے کیا وہ حسین بھی ہیں؟ میں کہوں گی "بالکل نہیں" ــــــ مگر دل تو ان کو اس سے زیادہ "کچھ" اور محسوس کرتا ہے۔

بس یہی ہے وہ کہانی جس کے سُننے کے لئے تم اس درجہ مُصر تھے کہ مجھے منافق کہنے سے بھی گریز نہ کیا۔ سُنی تم نے کس قدر بے کیف ہے تمہارے لئے یہ داستان! اب ہنس رہے ہو مجھ پر اسی لئے تو میں تمہیں نہ سناتی تھی ؎

لفظ نہیں۔ بیان نہیں۔ یہ کوئی داستاں نہیں
شرح نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

خیر اب کبھی مجھ پر ناراض نہ ہونا۔ میں نے تمہاری قدیمی شکایت

کی تلافی کر دی ہے اگرچہ مجھے ایسا کرنے میں کس قدر جراتیں اور ہمتیں مجتمع کرنی پڑی ہیں یہ میں ہی جانتی ہوں تم خود سوچ لو کہ دل کو زبان پر لانا موت کے ہم معنی ہے کہ نہیں؟ اس راز کے ساتھ خونِ دل کے وہ عزیز ترین قطرے جو اس کے بیان کرنے سے پہلے. کہتے وقت اور ختم کرنے کے بعد آنکھوں کے راستے بہا دینے پڑتے ہیں اب تمہارے سپرد ہیں اور دونوں امانتوں کی حفاظت بھی —— یہ بھی سُن لو کہ یہ وہ چیز ہے جو میں نے اپنی زندگی میں صرف پہلی اور شاید آخری بار تم سے اور صرف تم سے کہی ہے کہو اب تو شکایت باقی نہیں؟

سب کچھ بتا دینے کے بعد بھی میں تمہیں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ تم میری خلش کو آج تک نہ سمجھ سکے. میری بیتابیوں کو تم نے غلط معنی پہنائے محبت کا کانٹا میرے زخموں کا نشتر نہیں. یہاں تو چیز ہی اور ہے. مگر تم جانتے ہوئے بھی اسے نظر انداز کر دیتے ہو —— بھول جاتے ہو —— دیکھتے نہیں کہ نسیم دیسر ہو جانے کے بعد مجھ پر کتنے اہم فرائض عائد ہو گئے ہیں؟ اُن کی اہمیت پہ غور کرو اور میری بے دست و پائی اور بے چارگی بھی دیکھو. میری پریشانیوں کو خود مجھ سے ہی رسوا کرانا چاہتے ہو

تو سُنو!

اب میرے تمام جذبات اور امنگوں کا ماحصل اپنے فرائض کا احساس ہے اور اُن ہی کی ادائیگی کی دُھن قدرت کے منشا اور وقت کے تقاضا کے مطابق میں نے اپنی ہر ایک وہ محبوب شے برباد کر ڈالی ۔ جو میرے خیال کے مطابق کسی صورت سے بھی ادائیگی فرض کی سعی میں غفلت کا باعث بن سکتی تھی ۔ مگر جس چیز کے لیئے میں نے اپنی ذات کو تباہ کیا وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے ۔ اُف خداوندا ۔

تم نے زندگی کے متعلق میرے نظریات کو "مخدوش" کہا ہے ہو سکتا ہے کہ تمہارا خیال بھی درست ہو ۔ مگر انصاف سے کہو کیا وہ حقایق کا درجہ نہیں رکھتے ؟ پھر کیا تعجب ہے ۔ اگر وہ "مخدوش" بھی ہوں ؟ دنیا برائیوں کی ایک دلدل ہے اور زندگی اِس میں پرورش پانے والا کیڑا ——— زہریلا اور انتہائی خطرناک ——— غریب انسان پر یہ دونوں بلائیں مسلط کر دی گئی ہیں ۔

"دنیا وہ نہیں جہاں تم رہنا چاہتی ہو" ——— غلط کہہ رہے ہو تم! تم یہ کہتے کہ دنیا وہ نہیں جہاں بے رحم زمانہ مجھے زبردستی

چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے تو صحیح ہوتا یقین کر دیں اپنے ان جذباتی جراحتوں کے لئے کوئی اندمال نہیں چاہتی جو صرف میری ذات سے متعلق ہیں۔ ان کے حق میں تو میں قنوطیت ہی کو بہتر و افضل سمجھتی ہوں کیونکہ۔

دردے کہ مراہست بہ مرہم نہ فروشم

تم کیسے کہتے ہو کہ "یہ روح و دل کی موت ہے"؟ مجھے "محبت" ہوتی تو میں تمہارے اس قول کو حق بجانب سمجھ لیتی۔ لیکن میں نے تو "پرستش" سیکھی ہے —— صرف پرستش!! —— اور محبت کی تمناؤں کو جذبۂ پرستاری سے کیا نسبت؟ محبت ایک طوفان ہے اور وہ ایک غیر فانی جذبۂ خاموش —— طوفان آتا ہے اور جلد یا بدیر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ صرف ترقی کرنا جانتا ہے۔ ایک اشک ریز سکوت کے ساتھ یہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔

"ماضی مردہ ہے اور کبھی واپس نہیں آسکتا" سچ ہے۔ مگر میں اسے بلانا ہی کب چاہتی ہوں مجھے تو حال کی دلدوز حقیقتوں اور مستقبل کے افکار کے علاوہ اور کسی بات کی مہلت ہی نہیں۔ ہاں جب مایوسیوں کا اندھیرا اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ مجھے اپنی

حیات کی موت کا خطرہ ہونے لگتا ہے تو ماضی کو یاد کر لیا کرتی ہوں اور ایسا کرنے سے میری امنگوں کو جینے کا سہارا مل جاتا ہے

دہلی ۲۰ مارچ ۱۹۳۹ء

کرم گستر!

یہ تم نے "میری کہانی" پر اپنی "تنقید جمیل" کے حملے کیوں شروع کر دیئے نہ جانے تمہیں کیسے اس کی جرارت ہوئی؟ جانتے نہیں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تم میرے سینے کے ہر ایک زخم کو نوک نشتر سے چھیڑ چھیڑ کر کھیل رہے ہو اور پھر ساتھ ہی فتحمندانہ تبسم تمہارے لبوں پر رقصاں ہے۔ اُف رے بے چینی! —— گریۂ خاموش کا یہ بے کیف تسلسل جس کو میں نے تمہارے انتھک اصرار پر ایک "کہانی" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ تمہارے اس "جمالیاتی تجزیہ" کو شاید برداشت نہ کر سکے گا۔ اس لئے کہ یہ صرف محسوس کرنے کی چیز ہے سمجھنے اور پرکھنے کی نہیں —— آنکھوں نے ان کو دیکھا۔ دل میں احساسات پیدا ہوئے اور جذبۂ پرستش میں منتقل ہو گئے۔ میں نے اس جذبہ کا احترام کیا پورے پورے آداب کے ساتھ —— بس یہ تھی میری کہانی

اب تم اِسے نفسیات کی ترازو میں تولنے بیٹھ گئے تو یہ کوئی انصاف ہوا۔ بندۂ خدا ——— اگر میرے زخم کی داد نہ دینی تھی تو کم از کم یوں تو "پر افشاں" نہ ہوئے ہوتے!! تمہارے نظریات جس منطق کے دل آویز دلائل میں لٹک رہے ہیں۔ یقین کرو ان کو میرے جہاں کی رنگینیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ تم جن خیالات میں بہک رہے ہو وہ تو سراسر ادہام و ظنون ہیں۔ زندگی کی خارزار وادیوں میں ادہام و ظنون کا بندہ "اصل" کی تلاش میں ہمیشہ بھٹکتے ہی بھٹکتے عمر گنوا دیتا ہے۔ اس کو کبھی تسکین کامل نصیب نہیں ہوتی۔ اب دنیا کی ستم ظریفی دیکھو۔ یہ اُسے فلسفی کہہ کر پکارتی ہے فلسفی ——— اور وہ ایک حقیر لفظ سُن کر مسرور ہو جاتا ہے ——— بیوقوف ——— دیوانہ!! یہ نہیں سمجھتا کہ اِسی ایک آواز میں فطرت کے کتنے طنز اس کی ناکام حماقتوں پر مسکرا رہے ہیں۔ زندگی کے ٹیڑھے بیچیدہ راستوں میں بے شمار چھوٹے بڑے پتھر ڈال دیئے گئے ہیں وہ اِن سے بار بار ٹھوکر کھاتا ہے اور ہر ٹھوکر میں اس کا تمام قصر فلسفہ ایک بھیانک مگر خاموش آہ کے ساتھ منہدم ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی اِسے ہوش نہیں آتا۔ تم مجھے بھی ایسا

ہی فلسفہ سکھانے بیٹھ گئے۔ معاف کرنا مجھے تو اس سے دور ہی رہنے دو کہ میں یونہی اس کی قائل ہونا پسند نہیں کرتی۔ میں نے تو اپنی تمام عمر میں صرف دو ہی چیزوں میں اصل حیات کا مزہ پایا ہے ——— تسلیم و یقین ——— اور ——— محبت و پرستش ——— مگر میرے خیال میں ان سے بھی پورا پورا حظ اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ تا حد دیوانگی ہوں۔ اور اسی لئے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرا ہوش صرف جنون گیری جانتا ہے۔ تمہاری دنیا کے نشیب و فراز اس نے نہیں سیکھے۔ اس نے مزہ پایا ہے پرستش جنوں میں اور میں نے جنونِ پرستش میں! ——— پھر تم جانو کہ جنوں کو تمیزِ چناں و چنیں کہاں؟ اس لئے اگر میں یہ کہوں تو بُرا نہ ماننا کہ تمہاری اس تمام تر "فلسفیانہ بکواس" کا مطلب میری سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ تم میرے جذبۂ پرستش کو "خود فریبی" کہتے ہوئے اپنے لبوں پر شاعرانہ طنز کا تبسم پیدا کر لو۔ یا اُسے "عظیم الشان حماقت" سے تعبیر کرتے ہوئے فلسفیانہ قسم کی نفرت و حقارت کے قہقہے لگاؤ لیکن یہ یاد رکھو اس طرح تم میری دید کو "اصل نگہ" سے دُور نہیں کر سکتے۔ میرے یقین و اعتقاد کی قوتیں یوں آسانی

سے سلب ہو جانے والی نہیں۔ اب یہی تو میری حیاتِ افسردہ کا سہارا ہیں۔ انھیں بھی کھو دوں تو پھر تم ہی بتاؤ زندگی کہاں سے لاؤں؟ مجھے تو ابھی جینا ہے اس لئے کہ زندگی اور بیکسی؛ دونوں کی لاج رکھنی ہے۔ روح کی تسکین کے لئے اب یہی ایک تصوّر رہ گیا ہے جسے تم نے بیرحمی کے ساتھ بے محابا "خود فریبی" کہہ دیا۔ اس کی تباہی میرے مقصد کی بربادی ہے اور اس صورت میں مرنے کے بعد بھی چین کی امیّد نہیں۔

عزیز بھائی! جس طرح درد کی لذتیں دوا کی تاب نہیں لاسکتیں اسی طرح درد کی کہانی بھی کسی تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مگر اب کہ تم نے میری داستان پر تنقید کرتے ہوئے سکونِ روح کے اس محبوب ذریعہ کو فریب کہہ دیا ہے تو ذرا یہ بھی بتا دو کہ کائنات کی کونسی چیز سراب اور دھوکہ نہیں؟ جب یہ صحیح ہے تو میرے نزدیک ہر فریب یا مجاز بجائے خود ایک حقیقتِ مستحکم بھی ہے اور وجہِ حقیقت بھی ——— انسان کی زندگی اِن دونوں کے درمیان محصور کر دی گئی ہے۔ لیکن روح کے نشاطِ صحیح کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ ہے مجاز سے حقیقت پیدا کرنا۔ اب کہو اگر اب میں یہی کر رہی ہوں تو کیا یہ کوئی بلند مرتبہ کام نہیں؟ اسی

لئے پھر کہتی ہوں کہ تم سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھ سکے۔
تم مجھ سے بہت آگے نکل گئے ہو؟ — بالکل ٹھیک — لیکن یقین کی پختگی سے پہلے ہی۔ اعتقاد کی اکملیت سے پیشتر ہی — اور ہوا یہ کہ تم نے وقت کا ساتھ چھوڑ کر یقین و اعتقاد کی معصوم سادگیاں کھو دیں پرستش یا دوسرے لفظوں میں دامن عبدیت تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گیا کیونکہ تم نے شہید ہو جانا چاہا لیکن سر بکف ہونے سے پہلے مرنا چاہا لیکن موت کی وادیوں سے بچتے ہوئے — جینے کی سعی کی مگر راستے سے ہٹ کر — اب کہاں تک لکھوں۔ تم خدا جانے اس سے کیا کیا مطلب اخذ کر لو گے۔ تاہم اس چیز سے مطمئن رہنا کہ اس تحریر سے تمہیں چھیڑنا مقصود نہیں۔ یہ تمہارے اس فخر کا جواب ہے جسے تم بار بار دہرایا کرتے ہو۔ کہ "میں ان منازل سے گذر چکا ہوں"
"اس لئے سارے سنسار کو تیاگ دینے کی ضرورت نہیں!" — استغفراللہ!! ایسی عامیانہ بات اور تمہارے دماغ میں؟ مجھے تو خواب میں بھی اس کا گمان نہ تھا۔ کہ تم شاعر ہو کر بھی ایسی پھر ادر کز در بات کہہ سکتے ہو۔ سنسار کو تیاگ کر

تو ہر شخص کسی ایک کی پرستاریوں کی تکمیل آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس میں تمہاری یا میری کیا خصوصیت ؟ "تیاگ" نام ہے محبت کے اخلاص کی معراج کا! اور یہ اخلاص اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم اپنی ذات کو بھول کر دنیا کے درد کا احساس شدت کے ساتھ پیدا کر لیں دُنیا اور اُس کے متعلقات سے بے نیازی کامل کو میں بھی "تیاگ" نہیں کہوں گی۔ ایسا ہوتا تو کبھی بھی انسانیت اس دنیا میں اُجاگر نہ ہو سکتی۔

میری "ناعاقبت اندیشانہ کرم فرائی کا شکریہ" اور اس صورت میں کہ یہ "افسانہ" کہیں شائع ہو جائے؟ اپنی حسین شرارتوں کو اس درجہ بے باک نہ بناؤ۔ کیونکہ ستم ظریفی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہاں اگر اسے عام کر کے تمہیں کچھ مل جائے تو میں بھی سر تسلیم خم کر دوں گی۔ مگر دیکھنا شہناز کہیں روشناس نہ ہو جائے!!

تمہارے اِس خط کی دوسری اہم عبارت "اُن" کے نام کی تحقیق ہے مگر میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ خود میں نے آج تک اِس چیز کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اس لئے کہ "پریت کی ریت" کو اِن باتوں سے کیا تعلق؟ میرے لئے یہی بہت

کافی ہے کہ ان کو مجھ سے کوئی تعلّق تو ہے"۔ اس لئے بہتر ہو کہ
تم بھی ان کے نام کی جستجو میں نہ پڑو۔ پھر یوں بھی خدا کی قسم
مجھے خود اس کی تحقیق نہیں۔ البتہ ایک دھندلی سی یاد باقی ہے
اور خیال آتا ہے کہ مدّت گذری کبھی میں ان کو "زینی" کہہ کر
پکارتی تھی، مگر اب تو تم ان کو صرف "پریم" سمجھ لو کہ میں بھی ان
کو اس سے زیادہ اور کچھ سمجھنا یا دیکھنا نہیں چاہتی۔

میری مادّی پریشانیوں پر کڑھتے ہوئے تمہیں اپنی بے مائگی
کا احساس ہوا۔ آہ! کیوں شرمندہ کر رہے ہو!! مجھ ایسی بدنصیب
و بدبخت سے تمہارا خلوص وابستہ ہے یہی میرے لئے بہت
بڑی چیز ہے مخلص صادق کبھی "بے مایہ" نہیں ہوتے۔ دنیا
کے ذلیل کتے خلوص کی اہمیت کو کیا جانیں۔ انھیں تو بیکسوں کی
بے چارگیوں میں اضافہ کرنا آتا ہے۔ وہ دنیا کی غلیظ کیچڑ میں
اپنی نجس و پلید روح کو گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ سرد رو بشاش ـــــ
ذلیل جانور!! ـــــ بے حس حیوان!!

تمہیں میری مصیبتوں پر رحم آیا۔ کاش تمہارا یہ جذبہ عام
ہو جائے
ہندوستان کی کتنی بڑی آبادی ہے جو مجھ سے بھی بدتر حالت میں

ہے۔ ان بیچاروں کو ایک وقت شکم سیر کھانا بھی میسر نہیں ہوتا پھر
مصیبت یہ کہ وہ اپنی وضع کو بھی نہیں چھوڑ سکتے ان کی خودداریاں
کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بھی اجازت نہیں دیتیں لیکن مجھے
تعجب ہے کہ ان میں ایک دم بغاوت بلند کرنے کا جذبہ کیوں
پیدا نہیں ہو جاتا؟ —— بغاوت رسم و روایت کے اُن
خبیث اژدہوں کے خلاف جن کے واسطے انسانی قربانی کرنے
کا عزم ہمارا سماج ایک مدت سے کئے ہوئے ہے۔ نہ جانے کیوں
یہ کٹ نہیں مرتے اپنی حق طلبی کی راہ میں؟ تمہیں خدا نے نوجوان
فطرت عطا کی ہے —— حساس بنایا ہے اور دل میں درد
دیا ہے۔ کیوں نہیں عزم بلند سے کام لیتے؟ تمہاری لکھنے کی قوتیں
اگر تم اُن سے صحیح کام لو تو ہم دکھیوں کے لئے بہت کچھ مداوا
پیدا کر سکتی ہیں۔

دہلی ۱۷ر اپریل ۱۹۲۹ء

آتا ہے اک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

ہو سکتا ہے کہ تمہاری موجودہ خاموشیاں برحق ہوں اور

بہ کبھی معقول عذر کی بنا پر یہ مسلسل ہوتی جا رہی ہوں لیکن تمہیں نہ
یہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں میں بھی ان کی "صدائے بازگشت"
نہ بن جاؤں۔ سمجھے؟ —— یعنی یہ کہ نمونیا میں مبتلا ہوں —
موت سے قریب اور تم سے دور —— بمشکل یہ الفاظ لکھ
رہی ہوں۔

میں یہاں تو اب تک وجد ذوق کا یہ عالم ہے۔ کہ جب
کبھی تمہارا چھڑکا ہوا نمک زخموں سے گر جاتا ہے تو میں اسے
پلکوں سے چننے لگتی ہوں۔ مگر تم ہو کہ کہیں نمک دیکھ کر بھی یاد نہ
نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ میرے زخم جگر کی داد دیتے!!
تمہیں دوست کہتی ہوں اور دوست ہی سمجھتی ہوں۔ بس
اس تصور سے خیال میں تھوڑی بہت رعنائی باقی رہ گئی ہے تم
اسے بھی چھین لینا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی! میں صرف اتنا پوچھنا
چاہتی ہوں کہ تم کہاں ہو —— کیوں خاموش ہو اور کب آؤ گے؟
تمہارے ہوتے ہوئے بھی تم سے دور

شہناز

یہ تھا شہناز کا آخری خط۔ اس کے بعد اس کی کوئی تحریر مجھ

تک نہیں پہنچی ۔ البتہ ٹھیک اس وقت جب اس کی زندگی اور موت کے درمیان نزع کی چند ہچکیاں باقی رہ گئی تھیں اُس نے اپنے نحیف اور لرزہ بر اندام ہاتھوں سے مجھے ایک چھوٹی سی بیاض دی جو کہ مرض الموت میں بھی اس کے پہلو سے جدا نہ ہوئی تھی اس بیاض میں کیا ہے؟ —— اس کا جواب آسان نہیں مختصر طور پر اُسے ایک ڈائری سمجھ لیجئے جس کے اندر شہناز نے اپنی زندگی کی داستان پوری وضاحت سے بیان کر دی تھی اس کا اقتباس اس جگہ مناسب نہیں کیونکہ اس میں سیاست۔ سماج اور مذہب کی بابت ایسے باغی خیالات بھرے پڑے ہیں کہ شاید کوئی بھی ان کی اشاعت کی جرأت نہیں کر سکتا اور اگر یہ بھی ممکن ہو تو اس کی یہ تحریریں یقیناً ایک غیر متوازن دماغ کے "ہذیانات" سمجھی جائیں گی۔

اس کی "جواں مرگی" نے میرے ہوش و حواس کو کچھ اس طرح تہ و بالا کر دیا کہ ایک طویل مدت تک مجھے اس کی بیاض کے مطالعہ کی ہمت نہ ہوئی مگر ایک مرتبہ جب کہ میں یوں ہی اس کی ورق گردانی کر رہا تھا اچانک ایک پھٹا سا کاغذ اس میں سے نکل کر گر پڑا۔ میں نے اُسے اٹھا کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک نامکمل خط

جو اس نے شاید اپنی موت سے کچھ دیر پہلے مجھے لکھا چاہا تھا۔
آہ! ـــــــ لکھا تھا:۔

میرے ہمدرد غم شناس!

آؤ آج آخری بار نامراد شہناز کی دکھیا زندگی کی کراہ سُن لو تمہیں میں نے بہت پریشان کیا ہے۔ بہت رُلایا ہے، اب سوچتی ہوں مجھے اس کا کیا حق تھا! سماج کی نگاہوں میں میری یہ بے باکیاں ایک "مذہبی گناہ" اور تہذیب کی حدیث میں میری پرفشانیاں ایک اخلاقی جرم ہیں مگر کاش رسم و روایات کی گھناونی کیچڑ میں رینگتے ہوئے یہ کیڑے جن کو دنیا انسان کہہ رہی ہے۔ سمندر کی گہرائیوں میں تڑپتی ہوئی ماہی بے تاب کی حیات کا ایک حقیر سا لمحہ حاصل کر سکتے ـــــــ کاش ان کی جوان زندگی کے سینے میں وہی خون آشام کانٹا پیوست ہوتا جسے اپنی نامرادیوں کی یادگار سمجھ کر میں اپنے پہلو میں ہی لئے جا رہی ہوں ـــــــ ہاں اس وقت میں دیکھتی کہ وہ اپنے سماج اور اپنے روایتی ضابطوں کے مدنظر کس طرح اپنے کلیجے سے اُٹھنے والی آہ کا گلا گھونٹ سکتے ہیں؟ مجھے معلوم ہے کہ میرے اور تمہارے اس یکسر ملکوتی خلوص پر دنیا والے بدبختی کی نظریں ڈالنے لگے

ہیں۔ اور یہ انتقام ہے اس چیز کا کہ میں کیوں اپنی خودداریوں کا خون بہا کر اُن کے رحم و کرم کی بھیک مانگنے نہیں آئی۔ مگر مجھے مسرت ہے کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہی رہیں گے کیونکہ اب میرا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا ہے جسے دُنیا کا یہ آخری جھٹکا چھلکا دے گا۔ رخصت! میرے غمگسار!! ہمیشہ کے لئے رخصت!! میرے بعد ممکن ہے کہ تم اپنی زندگی میں کوئی جگہ خالی محسوس کرو اور میرے چھوٹے چھوٹے یتیم و بیسر بھائیوں کو دنیا کی بے درد ٹھوکروں میں دیکھ کر تمہیں بھی میری طرح سماج کے دیوتاؤں کے خلاف بغاوت کا جوش پیدا ہو اگر واقعی کبھی ایسا ہو تو تمہیں میری نامراد زندگی کی قسم اپنے قلم کی کوئی قوت اُٹھا نہ رکھنا۔ یاد رکھو دنیا میں تم وہ دوسرے انسان ہو جس کے واسطے میں نے اپنے اندر ایک روحانی سپردگی" کا جذبہ محسوس کیا۔ پھر کیا تم اس کے بدلے میں مجھے اتنا بھی نہ دے سکو گے کہ سماج اور عورت کی "مظلومیت" کو اپنے افسانوں کا ایک مستقل عنوان بنا لو؟ شہناز کی یہ آخری تمنا ہے۔ وہ شہناز جس نے ایک مرتبہ ناکام ہونے کے بعد پھر کوئی تمنا نہیں کی۔"

آہ ـــــ اُسے اب کیسے بتاؤں کہ میں نے اس کی تمنّا کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہے۔ میں نہ جانے کب سے چیختا پھر رہا ہوں مگر دنیا میں اتنی فرصت کسے ہے کہ ایک دیوانے کی بکواس کو سُن کر اپنے لمحات کا خون کرے!

مگر معبود! آخر کب تک تو بھی نہ سُنے گا؟؟

جواب طلب

نوٹ:۔ پروفیسر محمد مسلم ایم۔اے کا یہ افسانہ رسالہ ساقی دہلی نومبر ۳۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں اس کے جوابات طلب کئے گئے تھے۔ میں نے بھی اس کا "جواب" تحریر کیا تھا جو "ساقی" کی دوسری اشاعت میں نکلا تھا اور جو اس افسانے کے بعد یہاں نقل کیا گیا ہے۔ چونکہ "جواب" کا لطف اس افسانے کے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا اس لئے یہاں اس کی نقل کرنا ضروری معلوم ہوئی

مسعود جاوید

(۱)

عزیز عزیز۔ السلام وعلیکم

تمہیں یاد ہو گا تم نے اپنا ایک افسانہ جو اشاعت کے بعد بہت مقبول ہوا مسودہ کی صورت میں مجھے دکھایا تھا خیالات

کے انوکھے پن کے لحاظ سے بے مثل تھا مگر میں نے فوراً گرفت
کر لی کہ گالز ورد ی کا مال ہے ۔ تم نے انگریز اشخاص کے نام
بدل کر پارسی اور بنگالی ناموں سے اس کی شکل مسخ کرنے کی کوشش
کی تھی مگر آنکھ والوں سے اصلیت چھپ نہ سکتی تھی۔ میں نے تم
پر اردو کے اور افسانہ نویسوں کے ساتھ لپیٹ کر بہت لے
دے کی تھی اور اس فعل کو "چوری" سے تعبیر کیا تھا۔ تم اسے
"استفادہ" کہتے تھے اب تمہیں یاد آ گیا ہو گا۔ اس بحث کی
تکرار کی ضرورت نہ ہوگی۔ میرا یہ دعویٰ تمہیں ناگوار آیا تھا کہ
"مواد کا کال نہیں۔ ہمارے گرد و پیش ہر وقت افسانے کھیلے
جا رہے ہیں۔ روزمرہ کی سینکڑوں واردات میں ایک سے ایک
تخیّل کی تحریک کرتی ہیں۔ مبصّر اہلِ قلم ان پر قبضہ کر لیتے ہیں اور
ہمارے سامنے کاغذی پیرہن میں پیش کر دیتے ہیں۔ افسوس یہ
ہے کہ ہم میں قوّتِ تخیّل مفقود ہے۔ طبعزاد افسانے جن میں
زندگی کے پیچیدہ مسائل پیش یا حل کیے جائیں خود تیار نہیں کر سکتے
بلکہ چراتے ہیں یہ دماغی افلاس نہیں تو کیا ہے"۔

تم نے اسے بڑا بول کہا تھا اور مجھے چیلنج دیا تھا کہ ایسا
کوئی تجربہ ہی قلمبند کر کے دکھا دو تو جانیں۔

افسانہ میرا میدان نہیں۔ میں اس کھیل یا کرتب کا تماشہ بین رہا ہوں مگر جیسے تماشہ بین بعض اوقات جوش میں آکر میدان میں کود پڑے اسی طرح میں تھوڑی دیر کے لئے اس کھیل میں شریک ہو گیا ہوں یا پھنس گیا ہوں مگر شاید یہی تمہارے چیلنج کا کافی جواب ہو۔

بلا رنگ آمیزی و انشاپردازی مختصراً میرا ذاتی واقعہ سُن لو۔ چونکہ واقعہ سچا ہے مجھے صرف نام بدلنا پڑے۔ گفتگو زیادہ تر انگریزی میں ہے اس لئے زبان بھی زیادہ تر میری ہے۔

ایک مہینہ ہوا بیگم کو ساتواں بچہ تولد ہوا آخری دو بچوں کے درمیان صرف سوا برس کا فرق ہے ایسی عورت کی صحت کا کیا پوچھنا ہے۔ علاج کیلئے میں نے مسز بانسو کو بلایا عیسائی ہے۔ ہماری اسکی پرانی شناسائی ہے اسکا خاندان کبھی ہمارا ہمسایہ تھا ہم نے اس کو چھوکری بھی دیکھا! اور اسکی کافر جوانی بھی۔ میں قسم نہیں کھا سکتا کہ اس کیلئے میرے دل کے کسی گوشے میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ سینما کی ایک چلتی پھرتی چھاؤں تھی۔ تعلیم کے لئے وہ کلکتہ چلی گئی۔ شادی ہو گئی۔ برسوں باہر رہی۔ اور فراموش۔ اب وہ پھر مستقلاً یہاں رہ پڑی ہے۔

بیگم ——— مسز بانسو

مسز بانسو ——— آپ اپنی پرانی تلی کو بھول گئیں؟ میں تو وہی

شریر لڑکی ہوں جو آپ کے باغ سے امرود چرا کر کھایا کرتی تھی۔

بیگم ——— ہاں لڑکی مجھے یاد ہے۔ کھانے سے زیادہ تم برباد کرتی تھیں۔ تم اب بھی جوان ہی ہو۔ درختوں پر چڑھ سکو تو جاؤ امرود توڑ لاؤ اور کھاؤ۔

للّی ——— (ہنس کر) اب وہ مالی تو نہیں؟ اس کی ڈانٹ اور ڈھیلے اب تک یاد ہیں۔ داغ بھی موجود ہے۔ یہ دیکھئے۔ ہماری امرود کی چوری میں اکثر آپ کا بھی تو حصہ ہوتا تھا۔

بیگم ——— مدت کے بعد تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ برابر آیا کرو۔ تمہاری بہنیں اور ماں ہم سے کس قدر ملتی تھیں مگر تم تو اب ڈاکٹر ہو۔ اچھا ڈاکٹر علاج دلاج تو ہوتا رہے گا کوئی تدبیر کرو کہ اب بچہ نہ ہو۔ میں آپریشن کے لئے بھی تیار ہوں خواہ میں اس میں جانبر نہ ہوں۔

بس ——— گیارہ برس کے اندر سات بچے ہو گئے۔ ہر دوسرے برس عدم آباد سے ایک مسافر موجود ——— ان میں ڈیڑھ برس کا بھی فرق تو نہیں ہوتا۔ ہم ان ناخواندہ مہمانوں سے عاجز ہیں۔ یہ بچے کیکڑوں کی طرح ماں کو کھائے جاتے ہیں۔

للّی ——— (مسکرا کر) قصور کس کا ہے؟

میں ـــــ جو جنے

بیگم ـــــ (جھنپ کر) شرم تو نہیں آتی۔ یہ ڈھٹائی؟ للّی یہ باتیں جانے دو۔ میرے دکھ کا کوئی اور علاج نہیں۔ آپریشن کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟

للّی ـــــ بہن ہندوستانی اور مسلمان بیوی ہو کر بچّے روکنے کو کہتی ہو؟ اول تو آپریشن آئندہ صحت کے لئے سخت خطرناک ہے۔ دوسرے کون جانتا ہے زندگی کی کڑی منزلیں طے کرتے کرتے ان مسافروں میں کتنے رہ جائیں گے ـــــ توبہ توبہ اللہ سب کو رکھے مگر اس کی مرضی دعاؤں سے کہیں طاقتی ہے۔ اسی طرح مسز مکرجی نے چھ اولادوں سے تنگ آ کر عمل جراحی کرا لیا۔ عجب اتفاق۔ دو برس کے اندر وہ چھیئوں سدھار گئے۔ آج وہ ایک چوہیا کے بچّے کو ترستی ہیں۔ اگرچہ آپریشن کے سوا سب تدبیریں ناقابلِ اعتماد ہیں۔ جو کر سکیں کیجئے مگر بانجھ تو نہ بنئے۔ قدرت کے ساتھ زیادہ ڈھٹائی سے مقابلہ کرنا بڑا خطرناک ہے اور آپ تو مذہبی بیوی ہیں۔ یہ خدا سے مقابلہ کرنا ہے۔ مجھے دیکھئے۔ اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ ایک اولاد سے ابھاگی ہوں" ـــــ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

نسخہ لکھ کر اٹھی اور باہر نکل کر میرے ساتھ چمن میں ٹہلنے لگی پھول۔ پیڑ بیلیں دکھیں بھالیں۔ مجھ سے کہا" میں نے سبزی اور پھولوں کے امریکی بیج منگوا کر گاچھیاں تیار کی ہیں آپ تو کبھی آتے نہیں کسی دن آجائیے تو اپنا باغ دکھاؤں گا۔ گاچھیاں ضرورت سے بہت زائد ہیں۔ جتنی آپ چاہیں منگوائیں"۔ ——— کچھ پودے میرے ہاں سے لیتی گئی اور چلتے چلتے ایک بار اور اپنے ہاں آنے کی تاکید کرتی گئی۔

میں دو تین مخصوص احباب و اعزا کے سوا لوگوں سے بے ضرورت ملتا کم ہوں۔ للی نے فیس بھی نہیں لی تھی۔ بیگم کی حالت کی رپورٹ بھی کرنا تھی اور جی بھی چاہا۔ جانا پڑا۔ بڑی مسرت سے ملی۔ ہاتھ ملایا تو چھوڑا نہیں۔ لئے ہوئے اپنے باغ میں پہنچی اپنے پھول پھل سبزیاں دکھائیں۔ کچھ سبزیاں پھل اور گاچھیاں میری گاڑی میں رکھنے کی ہدایت کر کے مجھے لئے ہوئے کمرے میں آ بیٹھی ادھر ادھر کی باتوں میں الہٰیات۔ تصوف، مذہب اور اخلاق پر بحث چھیڑ دی اور میری دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی۔ تم جانتے ہو یہ میرا خاص میدان ہے۔ مذہبی رواداری اور بلند نظری کے پرچار کے لئے میں کافی بدنام ہوں۔ کہنے لگی

"میں نے حضرت محمد کے میلاد، سری کرشن جی کے جنم اور راجہ رام موہن رائے کی برسی کے جلسوں میں آپ کی تقریریں بڑی دلچسپی سے سُنی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ آپ سب دھرموں اور مذہبوں کو ایک ہی اعلیٰ اور پاک مقصد کے مختلف ذریعے سمجھتے ہیں۔ یہ راستے اتنے قابلِ اعتنا نہیں جتنی کہ اصل منزل مقصود ہے۔ آپ کی ایک ہی بتی اور رنگ رنگ کے گلوب کی مثال مجھے یاد ہے۔ دھرمیوں نے صرف اپنے اپنے مخصوص رنگ کے گلوبوں ہی کو روشنی سمجھ لیا ہے اور اصل روشنی یا مقصد دکھائی نہیں دیتا۔ اسی بھول سے سلھی گتھنا ٹیاں ہیں۔ آپ کا بھی عقیدہ اب بھی تو ہے؟"

میں ـــــ بے شک

للی ـــــ صرف عقیدہ ہے یا عمل کی ہمت بھی؟

میں ـــــ تمہارا مطلب؟

للی ـــــ مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی اعلیٰ مقصد اور اس کے ذرائع میں ٹکر ہو تو آپ ذرایع کی پرواکریں گے یا مقصد کی؟

میں ـــــ مقصد کی

للی ـــــ سمجھ کر جواب دیجئے۔ فرض کیجئے کہ آپ کو کبھی

بلند مقصد کے لئے ضرورت پڑے جھوٹ بولنے کی، چوری کرنے کی۔ نمازیں قضا کرنے کی۔ فرض روزے توڑ دینے کی حج ملتوی کرنے کی۔ تو آپ کریں گے؟

میں — میرے خیال سے کرنا چاہیئے۔ مگر ایسی صورتوں کا پیش آنا صرف قیاسی مفروضہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

للی —— جی نہیں عملی واقعات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں مثلاً ایک خوں ریز بلوہ فرو کرنا ہو جس کے لئے آپ جیسی ذی اثر شخصیت جس پر فریقین کو اعتماد ہو موجود نہ ہو اور آپ چلے جائیں حج کو —— محلے میں آگ لگ جائے یا سیلاب آ جائے اور اس کشمکش میں جلتوں اور ڈوبتوں کو چھوڑ کر آپ نماز پڑھنے لگیں یا افطار کرنے لگیں۔ کھنچی ہوئی تلواروں اور اٹھے ہوئے ڈنڈوں کو گرانے اور خوں ریزی کو روک دینے کے لیئے صرف ایک جھوٹ کافی ہو مثلاً یہ کہ "گائے کی قربانی روک دی گئی ہے۔ تم اپنے اپنے گھر جاؤ" مگر آپ کو اس جھوٹ میں تامل ہو اور تلواریں چل جائیں۔ گھر لٹ جائیں آگ لگ جائے۔ ایک یتیم کا وثیقہ اس کے چچا نے غصب کر لیا ہو اور وہ بے چارہ اس کے بغیر اپنی موروثی جائداد سے

محروم ۔ نانِ شبینہ کا محتاج گدا ہو۔ آپ اس کے چچا کے گھر آتے جاتے ہیں۔ وثیقہ چرا لا سکتے ہیں مگر چوری کو حرام سمجھتے ہیں۔

ٹی ——— تم تو بڑی منطقی مُقنّن ہو گئی ہو۔ تم اپنا مدعا صاف بیان کرو۔ چاہتی کیا ہو؟

لِلّی ——— میں سردست آپ سے صاف صاف سننا چاہتی ہوں کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ آپ کیا کریں گے؟ حالات کی نزاکت کے لحاظ سے اہم اور اعلیٰ مقصد پر مذہبی احکام اور اخلاقی قانون کو قربان کریں گے؟ یا نہیں؟

میں ——— میرا جواب پہلے سے تیار تھا۔ اتنی تقریر کی ضرورت نہیں تھی۔ مذہبی احکام ہوں یا اخلاقی یا قانونی میں کسی کو مطلق اور ناطق نہیں سمجھتا۔ سب حالات کے تابع ہیں اور سب کی روح بنی نوع انسان کی بھلائی اور سُکھ ہے اس اصول پر ہر اصول قربان کیا جا سکتا ہے اور موقع ہو تو میں خود حتی المقدور تیار ہوں بلکہ ایسی خدمتوں اور قربانیوں کا متمنی ——— خلقِ خدا کی خدمت کو میں خدا کی خدمت اور اس کی محبت کا تنہا وسیلہ سمجھتا ہوں۔

اس ڈھیٹ عورت نے میرا منہ چوم لیا۔ قبل اس کے کہ اس ناگہانی حادثہ کے متعلق میں کچھ سمجھتا اور فیصلہ کر سکتا

تیر میں تاثرات کی مصوری پر زیادہ وقت اور کاغذ صرف کرنا نہیں چاہتا۔ ایک سکنڈ کے اندر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ کر ہنستی ہوئی بولی:-

لِلی —— "میری اضطراری آزادی کو معاف کیجئے۔ میں اس خوشی کو ضبط نہ کر سکی کہ ایک آپ ہی میرے ہم مذہب نکلے ہیں بہتیرے تعلیمیافتہ۔ آزاد خیال۔ ہندو۔ آریہ سماجی۔ برہمو سماجی مسلمان۔ عیسائی اور پارسی سے اسی قسم کے سوال کر چکی ہوں مگر کسی نے "ہاں" کی جرأت نہیں کی"

میں نے اپنا بوسہ آلود کھچڑی مونچھوں کو رومال سے پونچھ کر پوچھا —— "آخر ایسی بحثوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ یہ تم نے نہیں بتایا" —— اس نے کہا "ابھی رہنے دیجئے پھر بتا دوں گی۔ مسٹر باسو (شوہر) کی دوا کا وقت آگیا ہے۔ ابھی پلا کر آئی"

پانچ منٹ میں آئی۔ دوسرے کمرے میں لے گئی چائے کا سامان کسی قدر تکلف کے ساتھ مہیا تھا۔ زبردستی مجھے سینڈویچ کیک چاکلٹ انگور سیب ٹھنسائے۔ چائے پیکر میں رخصت ہوا اور اتوار کو کھانے میں شرکت کا وعدہ لے کر اس نے بھیجا

چھوڑا

باقی آئندہ   تمہارا لطیف

(۲)

عزیز عزیزہ السلام و علیکم

—— تیسرے ہی روز اتوار تھا۔ وعدہ سے زیادہ مجھے اس کے "پھر بتا دوں گی" کے جواب کی بیتابی تھی اور سچ پوچھو تو اس ادھیڑ عمر میں بھی ایک گھڑی کا وہ اختلاط کچھ کم صبر آزما نہ تھا۔

صاف ستھری تو وہ ہمیشہ رہتی ہے۔ آج زرین جارجیٹ کی ساڑی پہنے اور بانکی وضع سے بال سنوارے زیادہ دلکش اور جوان نظر آتی تھی۔ اس کا شوہر مسٹر باسو بھی تھا۔ دمہ سے لوٹا ہوا۔ وہ کسی وقت ہڈ ماسٹر اور انسپکٹر مدارس رہ چکا ہے۔ فلسفہ کا ایم۔ اے ہے۔ کھانے پر مسئلہ کفارہ۔ شفاعت محبت۔ مکتی۔ نروان اور "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" کے مسائل پر خشک گفتگو رہی۔ للی نہایت توجہ کے ساتھ اس کی مخصوص پرہیزی غذا اس کے سامنے رکھتی جاتی تھی وہ کھاتا نہیں لونگتا جاتا تھا۔ وہ دو ڈھائی تولہ کھا کر اور زیادہ

بول کر جلد تھک گیا۔ ہانپنے لگا۔ اور معذرت چاہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہم کچھ دیر کھاتے رہے۔ فراغت کے بعد لِلّی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

لِلّی ــــ "آپ نے میرے شوہر کو دیکھا؟ ــــ کس قدر قابلِ رحم صحت ہے؟

میں ــــ واقعی۔

لِلّی ــــ اور مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ کم قابلِ رحم

میں ــــ ہرگز نہیں زیادہ۔

لِلّی ــــ لطیف صاحب لوگ مجھے بہت سکھی سمجھتے ہیں کیا سکھ یہی ہے؟ جیک آٹھ سال سے ایسے ہی ہیں۔ دمہ کے مارے ہوئے۔ اکثر خون بھی تھوکتے ہیں۔ ہاضمہ ردّی۔ اگر یہ درست ہوتا تو کھلا پلا کر میں انھیں کچھ دن سنبھال لے جاتی۔ جب ان پر دمہ کا دورہ پڑتا ہے تو بیاری بیاری رات ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی رہتی ہوں۔ یہ ہے میری خانگی زندگی۔

میں ــــ شراب کے شکار ہیں؟

لِلّی ــــ اور کیا؟ خود کردہ تو ہے ہی۔ اعصاب جگر دل سب از کار رفتہ ہیں۔ لا علاج۔ صرف زندگی کے باقی

دن بھرنا ہے۔ جوانی میں چوبیس گھنٹے مخمور رہتے تھے۔

میں ــــ مسیحیت کا پہلا تحفہ اور تہذیب کا پہلا سبق

تلی ــــ لطیف صاحب یہ طنز کا موقع ہے؟ میں بھی مسلمانوں سے بے خبر نہیں ہوں۔ چاہوں تو سینکڑوں کیڑے نکال سکتی ہوں۔ مگر اس وقت میری طبیعت کا یہ رجحان نہیں۔ آپ بے درد نہ بنیئے۔ جیک نصیحت و ملامت کی منزل سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اب ہم طعن یا نصیحت کے محتاج نہیں بلکہ ہمدردی کے بھوکے ہیں" ــــ آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

تم جانتے ہو میرا دل کتنا قوی ہے۔ کیسے کیسے مصایب کا کتنی دلیری سے مقابلہ کیا ہے۔ مگر کسی کے آنسو برداشت نہیں ہوتے۔ تر آنکھیں دیکھ کر میری آنکھیں نمناک ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اُس سے چھپا نہ سکا۔ اُس نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور اُسے دبا کر جیسے ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ گردن کھینچ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی ــــ سسکنے لگی۔ میرا ہاتھ چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے۔ پھر سر میرے کندھے پر ــــ ایسے مناظر میں میں خود کھو جایا کرتا ہوں۔ کچھ تفصیل یا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ خلاصہ یہ کہ اس کی آنکھوں سے درد و غم

اور میری آنکھوں سے ہمدردی و غمخواری کے آنسو بہہ رہے تھے ایک منٹ یا دس منٹ میں نہیں بتا سکتا۔ میں نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھے۔ اس نے بھی آپ کو سنبھالا۔ سیدھی بیٹھ گئی۔

میں ــــ ڈاکٹر کا دل تو پتھر ہوتا ہے ــــ للی ــــ تم کو ایسا بے صبر نہ ہونا چاہئے۔ میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا تو کرتا۔ یہ دکھ کیسے بٹا سکتا ہوں؟

للی ــــ مگر جو غم پتھر کو پانی کر دے۔ اُسے دل کیسے برداشت کرے۔ ہاں آپ چاہیں تو میرا دکھ بٹا سکتے ہیں۔

میں ــــ میں؟ ــــ کس طرح؟ (وہ چپ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی) بولو کس طرح۔ مجھ سے جو ہو سکے اپنے بس بھر تم سے کوئی دریغ نہ کروں گا۔

للی ــــ آپ بچن دیتے ہیں؟ مکر تو نہ جائیں گے؟ لائیے ہاتھ (میں نے ہاتھ پر ہاتھ مارا) ــــ سُنئے پچھلے روز میں نے آپ سے جو بات بتانے کا وعدہ کیا تھا اس کا بھی یہی جواب ہے۔ اور آپ اُس روز بھی قول دے چکے ہیں۔ بھولے تو نہیں؟ تو سُنئے میں اور جیک بھی اولاد کے لئے تڑپ رہے ہیں

مر رہے ہیں اور یہ ہم سے ناممکن ہے

میں ـــــ پھر کیا کر سکتا ہوں؟ میرا کوئی بچہ مانگتی ہو؟ مجھے عذر نہیں۔ مسز لطیف سے کہو۔ اُمید ہے انھیں بھی تم پر رحم آجائے گا۔ گو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

للّی ـــــ بیگم صاحبہ اپنا بچہ مجھے دیں گی؟ تعجب ہے آپ ان کو اتنا بھی نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں۔ ایسی ماں بچہ بچے جنتے جان دیدے مگر بچہ کسی کو نہیں دے سکتی۔

میں ـــــ پھر تم نے کیا علاج سوچا ہے جو میرے ہاتھ میں ہے۔

للّی ـــــ ایک علاج ہے انوکھا۔ آپ میرے ڈاکٹر ہیں میں مریضہ۔ وعدہ کیجئے بگڑئے گا نہیں تحمل سے سنئے گا۔ آپ اپنی تقریروں میں بلند آہنگی سے بار بار کہہ چکے ہیں کہ مذہب و اخلاق کا کوئی واحد معیار نہ مقرر ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ یہ بدل سکتا ہے اور بدلتا ہے۔ تو کوئی مذہبی یا رسمی قانون اخلاق تھوڑی دیر کے لئے برطرف کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

میں سوچ میں پڑ گیا تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ میں اس کا منہ تکتا رہا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ مگر آنکھیں پُرنم

میں ـــــ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟

للّی ـــــ (مسکراکر) جو آج سے بیس سال پہلے آپ مجھ سے چاہتے تھے۔ کیا وہ آنکھیں اور وہ باتیں بھول گئے ہوں گے ـــــ مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"
یہ غزل بھی تو آپ ہی نے سکھائی تھی جو آج بھی اس زمانے کی یاد میں پیانو پر کبھی کبھی بجاکر دل بہلا لیا کرتی ہوں۔ پھر سناؤں گی۔ سنئے گا؟

میں ـــــ ہاں ضرور۔ مجھے یاد ہے۔ مگر ؎

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

وہ ہم نہیں رہے وہ زمانہ نہیں رہا۔ للّی اب میری پوزیشن دیکھو۔ عمر دیکھو۔ مشاغل و رجحانات دیکھو۔ میری نوجوان اولاد کو دیکھو اور یہ باتیں ـــــ اصولاً میں اپنے عقیدے پر قائم ہوں مگر ایک معیار اخلاق معمولی معمولی بہانوں سے جذبات کی بنا پر توڑا نہیں جا سکتا۔ تم خود شوہر والی ہو جس سے تم کو محبت بھی ہے۔ اس سے بے وفائی پر آمادہ ہو ایک بچے کے لئے؟ کیا یہ فطرت الٰہی کا تقاضا ہے کہ ہر مخلوق فرداً فرداً بچے چھوڑ جائے۔ فطرت کا منشاء ضرورت سے زیادہ پورا ہو چکا

ہے۔ ہندوستان کو افزائش نسل کی ضرورت نہیں۔ کروڑوں کی روزانہ افزائش ہو رہی ہے۔ اگر کچھ مرد و عورت لاولد رہ جائیں تو اس میں حرج نہیں۔ سماج کا فائدہ ہے۔ ضرورت ہی اس بہانے سے معیار اخلاق بدلنے کی حاجت نہیں۔

للّی ــــــ آپ تو ایک سانس میں بہت زیادہ کہہ گئے ہیں سب باتوں کا جواب الگ الگ دوں گی۔ جوان تو نہ آپ رہے نہ میں رہی۔ یہی دلیل ہے اس بات کی کہ میری خواہش جذبۂ شہوت پر مبنی نہیں۔ اس کا جو وقت تھا میں اس وقت مسلمہ معیار اخلاق پر ثابت قدم رہی۔ رہی آپ کی موجودہ پوزیشن تو مجھے اسی کی ضرورت ہے۔ کیا اس عمر میں اپنی موجودہ پوزیشن کے ساتھ لونڈوں سے ایسی بھیک مانگوں؟ میں تو ایسا مرد چاہتی ہوں جو میری اس ٹیس کی تسکین کو گناہ نہ سمجھے بلکہ مقدس نیکی۔ کار خیر۔ کار ثواب ــــــ شوہر سے بے وفائی کو آپ نے کہا تو آپ ذرا ان کی باتیں سُنئے۔ وہی تو زیادہ بچے کے لئے بے چین ہیں۔ عیسائی کی حیثیت سے وہ دوسری شادی کر نہیں سکتے اور کریں بھی تو بے سود۔ وہ خود نیم جان ہیں۔ وہ اس لائق ہوتے تو مجھی سے اولاد کیوں نہ ہوتی۔ وہ ہندو سے عیسائی

ہوئے ہیں کچھ اس کا اثر اور کچھ فلسفہ کی خبط الحواسی کے ساتھ ہی رٹتے ہیں" للی ــــ بچہ ــــ ایک بچہ!! ــــ جہاں سے ہو ـ جیسے ہو ـ مگر تمہارا ہو ـ میری ہڈی نہ سہی تمہارا خون ہو ـ مرنے سے پہلے ایک بچہ دکھا دو" ــــ شاید وہ عیسائی ہونے پر بھی ہندو تخیل دل سے نہ نکال سکے کہ اولاد کے بغیر اخروی نجات ناممکن ہے ـ ایک سبب اور ہے

ان کے سب اعزا ہندو ہیں وہ اپنی اور میری جائداد اُن کے لئے چھوڑ جانا گوارا نہیں کرتے ہیں خود ایک عورت کی فطرت کا مقابلہ نہیں کر سکتی ـ فطرت ہی نہیں میری صحت بچہ کی محتاج ہے ـ اور میں ڈاکٹر کی حیثیت سے محسوس کر رہی ہوں کہ اگر جلد بچہ نہ جنی تو جیک کے ساتھ یا شاید پہلے ہی نامراد سدھار جاؤں ـ یہ دولت کس کے کام آئے گی ؟ میں ہمیشہ کیوں جاری رکھوں؟ کس کے لئے ؟ زندگی بے معنی بے کیف مہمل بیکار سی معلوم ہوتی ہے" (بلبلانے لگتی ہے)

میں ــــ دولت چھوڑ جاؤ خدا کے لئے اس کے غریب بندوں کے لئے ـ قوم و ملک کے لئے ـ

للی ــــ ہم اس بجھے ہوئے دل سے تو زندگی کا راستہ

نہیں چل سکتے ۔ آخر ہمیں جینے کا حق ہے ۔ ایک بچے سے ہم جی سکیں تو کیوں بے موت مر جائیں ؟ سماج کا یا مذہب کا معیار اخلاق ہمارے گلے گھونٹے دے رہا ہے ۔

میں ــــــ کسی سے بچّہ لے لو ۔

للّی ــــــ نہیں ۔ اس سے میری ممتا کی تسکین نہیں ہو سکتی اور صحت کے لئے بھی بیکار ہے ۔

میں ــــــ تو اس کار خیر کے لئے سارے جہاں میں ایک مجھ دیوانے ہی کے نام پر قرعۂ فال کیوں نکالا گیا ؟

للّی ــــــ قرعہ تو یوں ہی نکلتا ہے ۔ وجہ نہیں بتائی جا سکتی ۔ دوسرے سماج کے نقطۂ نظر سے ایک دیوانہ ہی اس کے لئے زیادہ موزوں ہے اور وہ آپ ملے ہیں ۔ کوئی دوسرا اسے کار خیر سمجھ نہیں سکتا ۔ اور سب سے بڑا سبب اور ہے ، مذہب و اخلاق کی نگاہ میں نہ سہی دل کی دنیا میں (مسکرا کر) ہمارا آپ کا پرانا رشتہ موجود ہے جو کسی کے ساتھ نہیں ۔ اس لئے میں بلا استحقاق آپ سے یہ بھیک نہیں مانگتی بلکہ ایک پرانا قرض طلب کر رہی ہوں جو آپ کے ذمہ آتا ہے جسے آپ بھولے ہوئے تھے ۔ میں معاف کر دیتی اگر ضرورت

نہ ہوتی - مگر مجھے آج اس کی حاجت ہے اور آپ کی گرہ میں رقم بھی موجود ہے۔" میں نے رُکتے ہوئے کہا "مگر ــــــ للّی ــــــ پر طبیعت ادھر نہیں آتی" ــــ للّی نے ایک آہ کھینچی ــــــ "خیر دیکھ لیں آپ کی لن ترانیاں بڑے بول جھوٹے وعدے - احساس ہمدردی (میں خاموش) للّی ــــــ لطیف صاحب آپ کو میرے دُکھ کی اصلیت کا شاید یقین نہیں اور میری خواہش کو ایک خواہش نفسانی سمجھے اس لئے ٹھکرائے دیتے ہیں - میں آج جیک سے طلاق لے لوں تو آپ کو مجھ سے عقد کر لینے میں عذر نہ ہوگا. گو میں وہی عورت ہوں گی - صرف ایک سماجی اور مذہبی الٹ پھیر - رسم اور دو بول مجھے ہر شخص پر حرام سے حلال کر دیں گے حالانکہ میرے شوہر کو طلاق کے بغیر اس مقصد طلاق کے حصول میں عذر نہیں بلکہ دل سے آرزومند ہے پھر یہ طلاقی گورکھ دھندے کی قید اور رسم و خرافات کی شرط سماج اور مذہب کی اندھی تقلید اور غلامی نہیں تو کیا ہے ؟ حضرت آپ کے لئے چار چار بیویاں بہ یک وقت بلا عذر جائز . لاتعداد لونڈیاں (جنگ کی اسیر سہی) مُباح ــــــ خواہ وہ سب کا فر شوہر والیاں

ہوں۔ مگر ایک مجبور و لاچار شوہر والی عورت صرف بچہ اور صحت کے لئے شوہر کی مرضی سے اپنے متاع ناموس کو بلا طلاق کچھ دیر کے لئے آپ کے پاس کسی قیمت پر گرو یا اجارہ بھی نہیں رکھ سکتی —— صرف کلمۂ طلاق سے اس کی واجبی قیمت مل سکتی ہے ؟ کہئے یہی ہے آپ کا دین الفطرۃ عدل۔ آپ کا فلسفۂ اخلاق جس پر آپ لکچر دیتے رہتے ہیں۔ یہ قلعی ایک تاؤ کی بھی تاب نہ لاسکی۔ آپ خیر سے مناکحت بین الاقوامی کا پرچار بھی کرتے پھرتے ہیں اور اپنی ایک ازدواجی رسم سے تجاوز کی مجال نہیں رکھتے۔ پھر دوسری قوموں سے آپ کیوں کر یہ توقع رکھتے ہیں۔

میں —— للی بس بس۔ میں سب کچھ محسوس کر رہا ہوں تم نے اچانک حملہ کر دیا اس لئے کچھ مختل سا ہو رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اکثر اوقات جذبات نفسانی اور ایمانی میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ نازک موقع ہوتا ہے۔ خطا و صواب میں۔ بال بھر فرق رہ جاتا ہے۔ ذرا سی لغزش سے انسان گمراہی کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔ مجھے کچھ وقت دو اور اچھی طرح سوچ لینے دو۔

للّی ــــــ (منہ تھتھا کر) اچھی بات ہے ۔ غور کریجئے اور میری بے حیائی کو معاف کیجئے گا

میں ــــــ للّی یہ نہ کہو میں تمہارے احساس کو خوب سمجھ چکا ہوں ۔ تم سے دلی ہمدردی ہے ۔ مجھے اتنا کٹھور نہ سمجھو"

ــــــ میں اٹھا اور اس کی افسردگی دفع کرنے کے لئے ہنستا ہوا یہ شعر پڑھتا چلا ؂

پھر پیار کی نگاہ سے ایک بار دیکھ لو
ہاں ایک تیر اور دل بے قرار پر

للّی ــــــ رہنے دیجئے یہ مردانہ چرتر ــــــ ہم عورتیں مفت بدنام ہیں ۔ مرد چنگاری چھوڑیں اور جب آگ اٹھے شعلے بلند ہوں تو بھاگتے نظر آئیں ۔

میں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا ۔

میں بیگم سے کوئی بات چھپاتا نہیں ۔ خانگی معاملات میں آئے دن لڑائی بھی ہوتی رہتی ہے مگر ہماری محبت اپنی جگہ پر ٹھوس ہے ۔ ان کو میرے اخلاق پر کامل اعتماد ہے اور مجھ پر بحالت سکون ان کی ذہانت اور نیکی کا سکہ ــــــ

اُن سے ساری داستان دہرا دی۔ صرف دیرینہ تعلقات کو چھپا رکھا اور پوچھا کہ للی اگر تم سے کوئی ایسی چیز مانگے جس کی تم کو ضرورت نہیں اور دے سکتی ہو تو دو گی؟

بیگم ــــــ اگر ایسی ہی چیز تم کو اُس کے شوہر سے درکار ہوئی تو تم مانگتے یا مجھے لینے دیتے؟

میں ــــــ میں شاید کبھی ایسا مخبوط الحواس نہ ہوتا۔ وہ دیوانہ ہے۔

بیگم ــــــ للی بھی دیوانی ہے کہ بچوں کے لئے مرتی ہے اس کا مزاہم سے پوچھے۔ تم دیوانوں کے لئے دیوانہ کیوں بنو اور جو بات اپنی بیوی کے لئے جائز نہ رکھو وہ دوسروں کی بیوی کے لئے کیوں روا رکھو۔ بچہ اگر بھری پستول کے لئے ضد کرے اور بلبلائے تو رحم کھا کر اسے دے دو گے۔ للی ہی کل خودکشی کرنا چاہے اور تم سے مدد مانگے تو خودکشی میں اس کی اعانت کرو گے؟ جس فعل سے نہ سماج کا فائدہ ہو نہ قدرت کا منشا پورا ہو ــــــ صرف ذاتی ہوس ــــــ اس کے لئے دوسروں سے اخلاقی قربانی چاہنا خود غرضی اور حماقت ہے۔

کہو عزیز تم نے دونوں عورتوں کی منطق سن لی! اب

کیا کہتے ہو؟ جواب دو مگر للہ اس واقعہ پر کوئی افسانہ نہ گھڑ لینا۔

تمہارا لطیف

جناب ایڈیٹر صاحب بجائے افسانہ گھڑنے کے یہ خطوط ناظرینِ ساقی کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں کہ جو صاحب چاہیں میری طرف سے لطیف کے نام کوئی معقول جواب صفحات ساقی میں تحریر فرمائیں۔ یوں لطیف صاحب کو متعدد دماغوں سے استفادہ کا موقع ملے گا اور یہ طبع آزمائی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی

(محمد مسلم۔ ایم۔ اے)

جواب

لطیف صاحب —— ہدیۂ نیاز!

تمہاری "حسین و جمیل پریشانیوں" کا حال معلوم ہوا۔ تم سمجھ رہے ہوگے کہ تمہاری معذوریوں اور لاچاریوں کی یہ داستان میرے ہوش و خرد کے لئے ایک "چیلنج" ثابت ہوگی لیکن مجھے تمہاری توقعات سے ہمدردی رکھنے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ تم "نرے احمق" ہو اور بس —— الٰہیات، تصوف، مذہب اور اخلاق کو تم بزعم خود اپنے "خاص میدان" سمجھتے ہو اور پھر انہی وادیوں کی ایک خوبصورت چٹان سے گر کر اوندھے منہ زمین پر آرہے ہو۔ مصر کی شعلہ فطرت ملکہ قلوپطرہ نے سیزر اور پھر انطانی کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے جس طرح الو بنایا تھا اس کا تذکرہ اور تجزیہ کر کے تم خود میرے سامنے بارہا قہقہے بلند کر چکے ہو۔ کلائیو۔ ہیسٹنگز اور خود موجودہ زمانے میں مسولینی کی ان جیرہ دستیوں کے متعلق جو اس نے ابے سینیا پر روا رکھی

ہیں۔ تم اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ تم نے قلوپطرہ کی ان تمام حرکات کو جو تاریخ میں ہوس کوشی اور نفسانیت کے نام سے تعبیر کی جاتی ہیں صرف اس لئے جائز سمجھا تھا کہ وہ "سیاسی چالیں" تھیں اور بقول تمہارے اُن کے پیچھے وطن و سیاست کے اعلیٰ مقاصد چھپے ہوئے تھے

پھر آج اسی قسم کی بلند اغراض کے سامنے خود تمہاری قوت کار کیوں لرزہ براندام ہوئی جاتی ہے؟ —— تم شاید اس کا جواب نہیں دے سکتے مگر میں بتاتا ہوں کہ تمہارا یہ تمام "پس و پیش" صرف اس لئے ہے کہ تمہارا ضمیر اور تمہاری فطرت سلیم ابھی تک تمہاری "علمیت و تعقل" کے اثرات سے کسی حد تک آزاد ہے۔

مگر تم اس طرح نہ سمجھو گے —— واقعات نے تمہیں اس قدر خوبصورت انداز میں فریب دیا ہے کہ جب تک اِس سراب کو ہر ذرّے کا دل چیر کر تمہارے سامنے نہ رکھ دیا جائے تمہاری "آنکھیں" "ریگِ رواں" کو "موجِ غلطاں" ہی سمجھتی رہیں گی۔ میں آئندہ سطور میں جو کچھ لکھنے والا ہوں وہ بہت آزاد چیز ہوگی اور اسی لئے اگر تم اپنی فطرت اور اپنی عقل کی فطرت کو بے نقاب دیکھنے

کی تاب بھی کھو چکے ہو تو باقی تحریر کو بغیر پڑھے نذرِ آتش کر دینا

تمہاری اس تمام "آفتِ ناگہانی" کا خلاصہ یہ ہے کہ للی جس کے ساتھ تم شباب کے زمانے میں چند پرشوق نگاہوں کا تبادلہ کر چکے ہو تمہارے پاس آتی ہے اور اس وقت کہ تم اور وہ ازدواج کی جدا جدا شاہراہوں پر کافی عرصہ بسر کر چکے ہو۔ للی تم سے اس "چیز" کی طالب ہوتی ہے جو بقول اس کے اس کی صحت امتا اور خاندانی ورثہ کے مدنظر ناگزیر ہے اور جو اس کا شوہر اُسے نہیں دے سکا۔ اُس کا مقصد اعلیٰ ہے لیکن ذرائع اخلاقیات کے لحاظ سے ناجائز ——— تم صرف "مقصد پرست" ہو لیکن پھر بھی "ذرائع" کے گھناؤنے پن سے خوف زدہ تم [illegible] کے "مقروض" ہو مگر ادائیگی سے محترز ——— وہ آج بھی اپنی صبح و شام کے بہت سے کیف آگیں لمحات تمہاری یاد پر رائگاں کر رہی ہے ——— "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" مگر للی کو آج بھی اپنے زمانۂ دوشیزگی کی وہ ساری "غزلیں" یاد ہیں جو تم نے ہی اُسے سکھائی تھیں ——— اُسے معلوم ہے کہ تم نظریات کے انسان ہو ——— علمی آدمی ہو ——— اس لئے خود تمہارے "میدانِ اخلاقیات" میں تمہیں شکست دے کر وہ اپنے

"سوال" کو جائز ثابت کر دیتی ہے۔

یہاں تک تو وہ تھا جو خود تم لکھ چکے ہو۔ اب ذرا وہ بھی سُن لو جو میں بین السطور میں پڑھ چکا ہوں —— تم للی سے وعدہ کر چکے ہو کہ "مجھ سے جو ہو سکے گا اپنے بس بھر کوئی دریغ نہ کروں گا" اس لئے اگر اس کا "سوال" تمہاری سمجھ میں نہیں بھی آیا تب بھی تم اخلاقی حیثیت سے ایفاءِ عہد کے پابند ہو چکے ہو —— پھر اسے بھی چھوڑو کہ تم شاید اسے ایک خالص "راجپوتی" چیز کہو گے —— خود اپنی اصولی نظر سے دیکھو۔ للی بقول خود ایک خالص انسانی و فطری ضرورت کے لئے تم سے "بچہ" چاہتی ہے اور خود اپنے شوہر کے باوثوق ایماء پر —— تمہارا ایمان ہے کہ بلندی اغراض کے لئے رسمی اخلاقی اصول توڑے جا سکتے ہیں —— ان حالات کے تحت ایک معمولی دل و دماغ کا انسان بھی یہی استنباط کرے گا کہ تمہارا "پس و پیش" قطعی بزدلی ہے اور تمہیں لازم ہے کہ "اولین فرصت" میں اس "فلسفۂ انسانی" سے سبکدوشی حاصل کر لو۔

کس قدر ناگزیر ہے یہ نتیجہ! —— کتنا لازمی اور حسین!!

—— مگر میں کہوں گا کہ اس کی حیثیت ایک منطقی فریب کی

زیادہ نہیں —— کیوں؟ —— اس کا جواب بہت سہل ہے تم للّی کے "سوال" کو اپنے اخلاق۔ الٰہیات وغیرہ وغیرہ کی روشنی میں تو دیکھ رہے ہو؟ —— مگر میں پوچھتا ہوں کہ حضرت ابن "لغویات" سے یہ مسئلہ کیسے حل کیجئے گا۔ یہ علوم "معیاری علوم" میں داخل ہیں۔ فلسفہ اخلاق بھی ایک "معیاری علم" ہے اس کی روشنی میں صرف اتنا ہی تو بتایا جاسکتا ہے کہ کوئی فعل "بحالتِ موجودہ" جائز ہے یا ناجائز —— مستحسن ہے یا معیوب —— لیکن حسن و قبح کا حکم لگانے سے پیشتر اس فعل کی "موجودہ حالت کی صداقت" بھی تو درکار ہے۔ تم اپنے جدید نظریۂ اخلاق کی رو سے صرف اتنا ہی کر سکتے ہو کہ للّی کی "استدعا" کو جائز یا ناجائز قرار دیدو لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کا مقصد واقعی اعلیٰ ہے یا نہیں؟ —— کیا للّی درحقیقت بچّے کی متمنی ہے؟ —— کیا یہ واقعہ ہے کہ اس کی "التجا" شہوانی خواہشات کا نتیجہ نہیں؟ —— تمہاری تمام اخلاقی عقل و خرد اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ یہ مشکل صرف ایک "مثبت علم" (Positive Science) کے ناخنِ تدبیر سے دور ہو سکتی ہے۔ کاش تم تھوڑی دیر کے

لئے اپنی توجہ نفسیات کے مسلمہ حقایق ہی کی طرف مبذول کر سکتے ——— آؤ یہ کام تمہارے لئے میں کر دوں!

تم نے للّی کو "چھوکری بھی دیکھا اور اس کی کافر جوانی بھی" اور تم یہ بھی قسم نہیں کھا سکتے کہ "اس کے لئے میرے دل کے کسی گوشے میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی" ——— لہٰذا اگر میں یہ کہوں تو غالباً غلط نہ ہوگا کہ شباب کے ہیجان پرور زمانے میں تمہارے اور للّی کے درمیان "ایک قسم کی محبت" تھی ——— وہی جسے تم نے "پرانی شناسائی" سے تعبیر کیا ہے

اس وقت تم دونوں کیا چاہتے تھے اور "یہ محبت" کس چیز پر مبنی تھی اس کی صورتیں صرف تین ہی ہو سکتی ہیں ——— اول محض شاعرانہ اور رومانوی تحسینِ جمال ——— دوم روحانی ارتباط ——— سوم جنسی تعلق ——— "تمہاری محبت" شاعرانہ اور رومانوی تحسینِ جمال پر تو قائم تھی نہیں کیونکہ اس صنف کے جذبات رکھنے والے انسان حسن کو "پیکرِ نسوانی" تک ہی محدود نہیں رکھتے۔ ان کی نظر میں ایک لہراتی ہوئی زہریلی ناگن میں بھی وہی جذب و کشش دیکھتی ہیں جو کسی دوشیزہ کی اٹھلاتی ہوئی جوانی میں ——— وہ لوگ اندھیری رات

کے تابناک ستاروں سے بھی اتنا ہی کسبِ کیف کرتے ہیں جتنا کہ کسی انسان کی دو حسین آنکھوں سے ممکن ہے۔ اُن کے نزدیک برگِ گُل پر قطراتِ شبنم بھی وہی جادو رکھتے ہیں جو کسی عارضِ رنگیں پر آنسوؤں کی بوندیں ——— حُسن کی پرستاری اُن کا مسلک ہوتا ہے خواہ وہ حسن کہیں بھی ہو ——— اسی لئے انھیں ہر ایک "حسین" سے عشق ہو جاتا ہے۔ تم اس بلند اور وسیع درجۂ ارتِ رندانہ سے یکسر عاری ہو ورنہ آج اس جھگڑے کی نوبت نہ آتی ——— محبت کی دوسری نوعیت یعنی "روحانی طلب" سے بھی تمہیں کوئی علاقہ نہیں ورنہ تمہاری تحریر میں آج یہ الفاظ نظر نہ آتے کہ "سیما کی ایک جیتی پھرتی چھاؤں تھی۔ تعلیم کے لئے وہ کلکتہ چلی گئی، شادی ہو گئی۔ برسوں باہر رہی اور فراموش ——— روحانی ارتباط بُعد و فاصلہ کی زیادتی سے ضعیف نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ شدید صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا یہ امر ظاہر ہے کہ تمہاری "پرانی شناسائی" جن امیدوں پر قائم تھی وہ صرف "لذاتِ جنسی" سے متعلق تھیں۔ تمہاری محبت محض جسمانی و جنسی اتصال چاہتی تھی ——— شرماؤ نہیں ——— یہ باتیں شرمانے کی نہیں

نفسیات کے حقائق ہیں۔ تم نے یہ تذکرہ چھیڑا ہے تو اب کھری کھری بھی سُننا پڑیں گی۔

تمہاری اور للّی کی یہ "تمنّا" مناسب تھی یا نامناسب اِس سے مجھے سروکار نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ "تمنا" تشنۂ تکمیل رہی ——— لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ انسانی ذہن پر مرتسم ہونے والا حقیر سے حقیر خیال بھی کبھی محو نہیں ہوتا ——— تمنّا اور "جنسی خواہش" تو ایک بڑی چیز ہے ——— نفسیاتی لحاظ سے "تمنّا" نام ہے ذہنی قوت کی ایک مخصوص مقدار کے متحرک ہوجانے کا ——— اگر خواہش کی تسکین حسب طلب پوری ہوجاتی ہے تو یہ متحرک قوت ختم ہوجاتی ہے لیکن ناکامی کی صورت میں یہی قوت "تحت الشعور" یعنی (S u B conscious mind) میں پوشیدہ ہوکر مستقل طور پر کارفرما رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ تم اپنی "شناسائی" کو ایک جنسی کشش نہ سمجھتے ہو اور اگر ایسا سمجھتے ہو تو شاید للّی کے زمانۂ فراق میں اسے بھولی ہوئی چیز تصوّر کرنے لگے ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ "تمنّا" تمہارے اور للّی دونوں کے "تحت الشعور" میں موجود رہی ——— تم نصف درجن سے زیادہ بچوں کے "قبلہ وکعبہ"

بن چکے ہو۔ اسی لئے واقعی تمہاری اس ناکام خواہش کو فراموش ہو جانے کی حد تک مضمحل ہو جانا چاہئے تھا ——— لیکن للّی؟ ——— اُس کا حال تم جانتے ہی ہو تم سے اُس نے خود کہا کہ "جیک آٹھ سال سے ایسے ہی ہیں۔ دمّہ کے مارے ہوئے۔ اکثر خون بھی تھوکتے ہیں۔ ہاضمہ ردّی ——— شوہر کی اس ناگفتہ بہ حالت نے للّی کی اس پرانی "تمنا" کو اور زیادہ شعلہ ساماں ہی کیا ——— یہی وجہ تھی کہ لیڈی ڈاکٹر اور مسز باسو کی حیثیت میں جب وہ تم سے ملی تو "بیباکیوں" کی ابتدا اُسی کی طرف سے ہوئی۔

غالباً امور بالا کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچنا غلط نہیں کہ للّی کی موجودہ خواہش اور التجا اُسی چیز کی دوسری صورت ہے جو تم اور وہ اپنے زمانہ شباب میں لفظ "شناسائی" سے تعبیر کرتے تھے ——— یعنی ایک محروم تکمیل شہوانی جذبہ ——— للّی اور تم اس زمانہ میں سوسائٹی اور واقعات سے مجبور ہو گئے ورنہ آج للّی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی کہ "اس کا جو وقت تھا میں اس وقت مسلمہ معیار اخلاق پر ثابت قدم رہی" ——— آج وہ پابندیاں دور ہو گئیں اور تحت الشعور

کی "ناکام تمنّا" کو یہ موقع ملا کہ للّی کو اپنی تکمیل کے واسطے مصروف عمل کر دے۔

تم دونوں کی فطرت کے اس نفسیاتی تجزیہ و تحلیل سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے ثبوت میں ایک دو پُر لطف باتیں اور بھی سُن لو۔ سب سے پہلے تو شاید تمہیں وہ بے اختیار و غیر متوقع "بوسہ" یاد ہوگا جو للّی نے تمہاری "کھچڑی مونچھوں" پر ثبت کیا تھا۔ دوئم خود تمہاری تحریر کے یہ الفاظ کہ "صاف ستھری تو وہ ہمیشہ رہتی ہے آج زرّین جارجیٹ کی ساڑی پہنے اور بانکی وضع سے بال سنوارے زیادہ دلکش اور نوجوان نظر آتی تھی"۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر صرف اولاد کے لئے اور صحت کے واسطے تمہیں "دعوتِ عمل" دی جا رہی تھی تو اِن خالص جنسی لوازمات کی کیا ضرورت تھی؟ "زرّین جارجیٹ کی ساڑی" اور "بانکی وضع کے بال"!! —— کیا یہ سارے افسوں صرف اس لئے نہیں تھے کہ منطقی استدلال کے ساتھ ساتھ تمہاری عقل و ہوش پر جنسی جاذبیت سے بھی پے بہ پے حملے کئے جائیں؟ —— اور پھر خود "بوسہ"!!

اُف! میں تو کہتا ہوں کہ اگر تمہارے نظریہ اخلاق سے بھی تمہیں

شکست نہ دی جاتی تو صرف ہی ایک بے پناہ جادو تمہیں "عجز خاموش" بنا کر رکھ دیتا۔ اگر تم فرائڈ اور یونگ جیسے جنسی نفسیاتی محققین سے استصواب کر سکتے اور صرف ایک یہی واقعہ بیان کر دیتے تو غالباً تمہیں وہی جواب ملتا جسے اس وقت میرے قلم کی زبانی سُن کر تم جذباتِ حجاب سے تھرتھرا رہے ہو ——— لیکن شاید تمہیں اس وقت للی کے ان الفاظ کا خیال آئے گا کہ ——— "میری خواہش جذبۂ شہوت پر مبنی نہیں" ——— یہ الفاظ حسین ضرور ہیں لیکن ان کا جو کچھ مفہوم ہے وہ اب تم خود سمجھ سکتے ہو۔ عورتیں اکثر زبان و دل کا تضاد رکھتی ہیں ٹیگور نے اسی لئے کہا ہے کہ جب عورتیں "ہاں" کہتی ہیں تو ان کا مطلب "نہیں" ہوتا ہے"۔ پھر ایک طرف للی کے اس دعوی کو رکھو اور دوسری طرف ڈاکٹر ٹالمی جیسے ماہر نفسیات جنسی کے یہ الفاظ کہ ——— "جبلت جنسی کا حقیقی مقصد (یعنی اولاد پیدا کرنا) انسانوں کی نظر سے مستور رکھا گیا ہے۔ ایسا غالباً کبھی نہیں ہوتا کہ باہمی محبت اور جنسی رغبت افزائش نسل کے باشعور ارادے پر مبنی ہو۔ افعال جنسی کی تمنا اکثر و بیشتر محض نفسانی جذبات کی تسکین کے لئے کی جاتی ہے"۔

ممکن ہے للی خود بھی اپنی خواہشات کی حقیقی نوعیت سے ناآشنا ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی ساری جدوجہد صرف جنسی تعلق کے لئے سرگرم کار ہے۔ پھر اگر بُرا نہ مانو تو چپکے سے یہ بھی سُن لو کہ خود تم بھی چاہتے ہی ہو ـــــ اور "یہ چاہتا" اُسی قسم کا ہے جس کو نفسیات کے ماہرین صرف تحت الشعور کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ تمہاری ساری تحریر اسی ترحم طلب معذوریوں کا رنگ رکھتی ہے جیسے کوئی انسان جرم و قصور کا ارتکاب کرنے سے پہلے اپنی آئندہ حرکات کو ناگزیر کہہ کر جائز ثابت کرنا چاہتا ہو۔ تمہارا ایک ایک لفظ شاہد ہے کہ تم ایک مختصر و ضعیف اصرار کے باوجود پہنچنا چاہتے ہو اُسی نتیجہ پر جس کی طرف للی شعوری یا غیر شعوری حالت میں تمہیں لے جا رہی ہے۔

لہٰذا اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ تمہیں للی کے ان شہوانی جذبات کا پاس مناسب ہے یا نہیں؟ ـــــ اس کا جواب تم خود ہی اپنی تحریر میں دے چکے ہو ـــــ "ایک معیار اخلاقی معمولی معمولی بہانوں سے جذبات کی بنا پر توڑا نہیں جا سکتا" تمہارے یہی الفاظ ہیں جن کی بنا پر مجھے شروع میں کہنا پڑا تھا کہ تمہاری فطرت سلیم ہنوز تمہاری علمیت و تعقل سے کسی حد تک آزاد ہے ـــــ

للّی اور رخو دا اپنی فریب خوردگیوں کو تم بے نقاب دیکھ چکے۔
اب ذرا اپنی بیگم کی صداقت گفتاری بھی ملاحظہ کر لو ——— "جس فعل سے نہ سماج کا فائدہ ہو نہ قدرت کا منشا پورا ہو ——— صرف ذاتی ہوس ——— اس کے لئے دوسروں سے اخلاقی قربانی چاہنا خود غرضی اور حماقت ہے۔"

کہو لطیف اب تو تم دونوں عورتوں کے خیالات کی نوعیت دیکھ چکے ——— اب کیا کہتے ہو؟

شباب و شعر

مندرجہ بالا عنوان یوں تو ادب لطیف کی پوری رومانیت پر لبسیط نظر آتا ہے اور جذبات کی اس نیم بیداری سے لے کر جو گاہے گاہے زندگی کے تمام جاذبیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیتی ہے احساسات کے اس اشتعال تک جو دل کو ایک انگارے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ سب کچھ "شباب و شعر" کے وسیع حدود میں آسکتا ہے، تاہم میں اس جگہ اس جاذب نظر عنوان کے تحت دو خطوط پیش کرنا چاہتا ہوں جو دو دوستوں کے حیرت انگیز تجربات لطیف پر مشتمل ہیں اور دو باب ہیں ایک ایسے افسانے کے جس میں محبت کے بلند ترین تخیل کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ مجھے پورا احساس ہے کہ اکثر قارئین محبت

کے اس نظریہ کو "شعر محض" اور غیر مطابق فطرت تصور فرمائیں گے لیکن اگر ان سطور کو پڑھ کر سماج کے ناخداؤں کے پندار پرست جذبات میں ایک خفیف سی پشیمانہ لرزش بھی پیدا ہو گئی تو میں مطمئن ہو جاؤں گا کہ اس طرح ان خطوط کی رسوائی کا متصوّر فائدہ حاصل ہو گیا۔

مسعود جاوید

لکھنؤ - ۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء

پیارے مرادؔ!

عرصے سے تمہارا کوئی مکتوب موصول نہیں ہوا۔ کیا "ماہ نوشیں" کے رنگین ایام تم جیسے پختہ طبع انسان پر بھی ایسی زبردست وجدانی گرفت حاصل کر سکتے ہیں؟ میں تمہاری فطرت کے جس ظالم راز کی جستجو میں ہوں کیا وہ تمہیں اس قدر عزیز ہے کہ اپنے عزیز ترین دوستوں کو فراموش کر دینا بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟ —— مگر سمجھ لو مرادؔ ہمیشہ کے لئے کہ —— جتنا بھلاؤ گے مجھے اتنا ہی یاد آؤں گا میں "کیونکہ یاد آنے والے کو جبراً بھلا دینا

بھلا دینے کا کامیاب طریقہ نہیں ثابت ہوا کرتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ تمہارا یہ احتراز میرے شوق کو تیز تر ہی کر رہا ہے۔ تمہاری دامن کشی میری "تلاش" میں روح پھونک رہی ہے۔ جو سوال میں نے آج سے تقریباً ایک ماہ پیشتر کیا تھا وہ اس وقت بھی کرتا ہوں اور اس مرتبہ زیادہ ذوق و اضطراب کے ساتھ ——

میں جانتا ہوں اور صحیح جانتا ہوں کہ تمہیں ناہید سے محبت ہے اور ناہید کو تم سے —— پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ناہید کو اپنی شریک حیات بنانے سے تم کیوں محترز تھے اور اب اس کو شریک حیات بنانے کے بعد کیوں مضمحل و پریشان اور مجتنب ہو؟ ——

بی۔ اے میں فلسفہ پڑھ لینے سے انسان "فیلسوف گریاں" نہیں بن جاتا اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو محبت کی کاہشات کا زندہ تجربہ ہر ایک منطق سے دماغ کو آزاد کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں جذبات حکومت کرتے ہیں جو سیلاب کی طرح عقلی مصلحتوں کو بہالے جاتے ہیں۔ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ معاملات محبت میں عقل بھی دخل دیتی ہے۔ مرد "سوچتا ہے" مگر محبت کرنے کے بعد —— عورت "سوچتی" ہے مگر محبت کرنے سے پہلے —— لیکن یہ سب کچھ جذبات کے صحیح ہیجان کے قرائن نہیں ہوتے۔ حقیقی محبت طوفان کی طرح

آتی ہے اور سوچنے کا موقع کبھی نہیں دیتی —— کبھی نہیں ——
نہ پہلے نہ بعد —— یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ فطرت کا ایک
عالمگیر قانون ہے جاری وساری —— اپنی زندگی میں مجھے
ایک تم —— ہاں مراد صرف تم ہی —— ایسے انسان نظر
آئے ہو جو اس قانونِ فطرت کی ہمہ گیری سے شاید مستثنیٰ ہے۔
اس زمین و آسمان کے درمیان رہنے والوں میں صرف تم ہی اس
قدر "عجیب" کیوں ہو اور کس لیے ہو —— یہی میری تمام جستجو
کا مقصد ہے اور یہی میں تم سے بار بار دریافت کر چکا ہوں۔
تمہاری شادی کے موقع پر جب میں نے تمہیں زرد رو اور مضمحل
دیکھ کر یہی پوچھا تھا تو مجھے یاد ہے تم صرف مسکرا دیئے تھے جبراً
ایک بیمار کی طرح —— کیا ایک حقیقی ہمدرد کی بے لوث پرسش
کا جواب اہلِ دل اسی طرح دیا کرتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ کامیابِ
محبت ہونے کے باوجود تم ایک روح گسل غم کا شکار ہو رہے
ہو۔ مجھے بتاؤ کہ کیا یہ غم محبت کے علاوہ کسی اور جذبے کی
بے بسی سے متعلق ہے؟ تم مجھ سے اپنی فطرت کا راز کیوں چھپاتے
ہو؟ تم نے اس پردہ داری سے جو نقصان اپنی صحت کا کیا ہے
وہ تمہارے واسطے خطرناک ترین شے ہے مرزا!

شمع کی طرح چپکے چپکے گھلنا نہ محبت کا صحیح اقتضا رہے اور نہ عقل کا ـــــــ پروانے کی طرح بھسم ہو جانا سیکھو۔ شمع کی اس "بزدلی" کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہوتا ہے ـــــــ صرف یہی کہ اُس کے "امروز" سے اس کا "فردا" ناآشنا رہتا ہے۔ پروانے کی جراٰت رندانہ بیش قیمت شے ہے۔ وہ جل جانے تک "پروانہ" ہے اور جلنے کے بعد ایک "جگنو"!

اگر تم مجھے ایک غیر ذمہ دار شخصیت تصوّر کرتے ہو اور میری جستجو کو ایک "شوق بیکار" تو مرآد آؤ میری فطرت کی گہرائیوں کو دیکھو۔ کالج میں پہلی مرتبہ تم سے متعارف ہونے کے بعد تمہارا خیال میرا دل ہی بنتا گیا ہے۔ خدا جانے تمہارے اندر میری روح نے کیا پایا ہے کہ تمہیں بھول جانا نہیں بالکل بھول چکا ہوں تمہارے محاسن میری "بیاضِ محسوسات" کے زرّین اوراق پر تحریر ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ کس طرح اوّل اوّل تم نے اپنی محبت کے واقعہ کو بھی مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی سخت ترین کوششیں کی تھیں۔ تم بھی شاید نہ بھولے ہو گے کہ کس طرح میں تمہارے مضامین کے ذریعے اور تمہارے اشعار و جذبات کے سہارے اس رازِ محبت کی طرف آنے کی سعی کیا کرتا تھا اور آخر کار کس طرح

ناہید کے ایک پوشیدہ خط کو اتفاقاً پڑھ لینے کے بعد اپنی تلاش میں کامیاب ہوگیا تھا!! تم یہ سب کچھ نہیں بھولے ہوگے مرادؔ مگر سوچا بھی کبھی تم نے کہ میری یہ حرکات اپنے اندر کیوں اس قدر حدّتِ شوق اور سرگرمئ اضطراب رکھتی تھیں؟

صرف اس لئے عزیز مرادؔ تمہیں برباد ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا میرے ضبط کی تمام قوتوں سے زیادہ ہے۔ پھر یہ بھی تم نے دیکھ لیا کہ یہی "ضبطِ مجروح" تمہارے راز کو کس طرح اپنی روح بنا سکتا ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ تم سمجھتے ہو اور جانتے ہو۔ مگر پھر بھی یہ اخفا کیوں ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس پردہ پوشی کی وجوہات کیا ہیں؟ کیا تم اپنے "دردِ نہاں" کو چارہ پذیر نہیں سمجھتے؟ کیا تمہاری فطرت قنوطیت پسند ہوچکی ہے؟ اگر ایسا ہی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تم اغلاط کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہو انسان جب تک زندہ ہے امید اس کی زندگی ہے —— مگر موت بھی ایک امید ہے جو زندگی کی ساری امیدوں کو تسکین دینے کی اہلیت رکھتی ہے۔ بشرطیکہ انسان قدرت کی کارفرمائیوں کو رجائی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی خو پیدا کرے۔ پھر اسے بھی چھوڑ دو قنوطیت اور تمہاری حالت؟ —— قطب نما کی دو سوئیاں

ہیں جو کبھی ایک سمت پر متحد نہیں ہو سکتیں۔ تم جوان ہو۔ ذہین و تعلیم یافتہ ہو۔ متمول بھی ہو۔ محبت تم نے کی ـــــ محبت تمہاری ہو گئی۔ ناہید سی خوبرو اور محبت کرنے والی دوشیزہ تمہاری رفیق زندگی بن چکی۔ محبت کی لذید ادائیں تمہارے اشارۂ ابرو پر سر بسجود ہونے کو تیار ـــــ حسن کی شیریں فردوسی برکتیں تم پہ پروانہ وار نثار ـــــ حسن و محبت کی ہم آہنگی سے پیدا ہونے والے "نغمے" تمہاری سماعت کی ملکیت ـــــ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم قنوطیت پسند اگر ہو تو کیوں ہو؟ کیا یہ دنیا اس سے زیادہ نعایم کسی انسان کو بخشتی ہے اور کیا کوئی انسان ان نعایم سے حظ اندوز ہوتے ہوئے قنوطیت پرستی کی جرارتِ کافرانہ کر سکتا ہے؟؟

تم اپنے اضمحلال و افسردگی کے سکون سوز نتائج کو اپنے تک محدود نہ سمجھو۔ میری زندگی کی جنبش بھی سست ہوا چاہتی ہے جب تمہاری کھوئی ہوئی صورت کا تصور کرتا ہوں اور تمہارے رازِ غم کی تفہیم کے سامنے اپنے دل و دماغ کی قوتوں کو "عجز خاموش" پاتا ہوں تو بادر کرو طبیعت بجھنے لگتی ہے اور دل کی ساری کائنات دھڑکتی رہ جاتی ہے۔ پھر مجھے بھی چھوڑ دو

خود ناہید کا بھی فکر ہے تمہیں؟ ـــــ عورت ایک جگہ اور ایک دفعہ محبت کرنا جانتی ہے۔ اُس نے تمہیں چاہا اپنی دوشیزگی کی پوری پاگیزگی معصومیت کے ساتھ ـــــ تم اُسے مل گئے لیکن کس قدر ظلم ہے کہ تمہاری افسردگی اُس کو اپنی اس خوش نصیبی پر مسکرانے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ مجھے پوری طرح احساس ہے اور معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ناہید تمہاری موجودہ حالت کے اضمحلال سے افسردہ خاطر ہے۔ تم خیال نہیں کرتے مراد کہ ناہید کے معصوم ہونٹ ایک بے اختیار تبسم کے واسطے کتنی مدت سے تھرتھرانے کی کوشش کر رہے ہیں؟ اس کی نور پاش آنکھیں دل کے ان جذبات کو جو اس نے کبھی کسی اور مرد کے سامنے بیدار ہوتے محسوس نہیں کئے تم سے کس قدر عرصے سے کہنے کی سعی کر رہی ہیں؟ اس کے حسن کی "ملکوتیت" تمہاری محبت کے انتظار میں انگڑائیاں لے رہی ہے مگر تم بے حس ہو۔ کیا تمناؤں کا یہ بے دردانہ خون کیوپڈ اور وینس کو کبھی گوارا ہو سکتا ہے؟ تمہارا ضمیر گونگا ہو گیا ہے کیا؟ تمہاری "حیات" بے جان تو نہیں ہو گئیں؟ تم اپنے دل کو دل کیوں نہیں بن جانے دیتے ـــــ آتشکدہ کی طرح دہکتا

ہوا دل؟ — اُٹھ مراد! زندگی و محبت پکار رہی ہے ناہید کی حیا خیز خاموشی کو متکلم بننے دو اس کی خشک آنکھوں کو تبسّم کی بوندوں سے شرابور ہو جانے دو۔ "محبت کرنا کچھ نہیں محبت کیا جانا البتہ کچھ ہے۔ لیکن محبت کرکے جواباً محبت کیا جانا سب کچھ ہے" — اور یہ "سب کچھ" تمہیں نصیب ہے۔ پھر یہ سوگواریاں کیوں ہیں؟ یقین کرو کہ تمہاری موجودہ حالت اب تمہاری ذات سے محبت کرنے والوں کے لیے ناقابل برداشت ہو چلی ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ تم اپنے "ہمراز" سے اس مرتبہ بھی مجھے محروم نہ رہنے دوگے۔ شاید تم محسوس کرو کہ میں تمہارے ذاتی معاملات میں حد سے زیادہ دخیل ہو رہا ہوں — بیشک یہ صحیح ہے — لیکن اس کا استحقاق مجھے عرصہ ہوا کچھ اس طرح حاصل ہو چکا ہے کہ اب تمہارا انکار بھی بے بس ہے۔

تمہارا — شاہد

دہلی ۲۵ر جنوری ۳۴ء

ہمراز!

تمہارا مکتوب کیا تھا دلائل کا ایسا حسین تسلسل تھا جس پر

ادبیت کی تمام رنگینیاں بھی قربان ہو جائیں میں تمہیں بھولا نہیں دوست!!۔۔۔ خط و کتابت کی تعویق کا سبب "فراموش کاری" نہیں بلکہ وہی "وہی خود فراموشی" ہے جسے ایک "راز" سمجھ کر تم ڈھونڈ رہے ہو۔ اسوقت جب کہ میرے دل کی ہیجانی دھڑکنیں موت کا قرب محسوس کر رہی ہیں تم میری زندگی کے راز کو دریافت کرنا چاہتے ہو۔ میری تمنائیں پوری نہیں ہوئیں تو میں تمہاری اس تمنا کو ناکام بنا کر کیوں انتقام لوں؟ ۔۔۔ آؤ دیکھو کہ مراد کی اس افسردگی اور دوارفتگی کا سبب کیا ہے۔

اس زمین و آسمان کے درمیان رہنے والے انسانوں میں صرف میں ہی اسقدر "عجیب" کیوں ہوں؟ ۔۔۔ اس لئے کہ اس زمین و آسمان کے درمیان رہنے والوں میں سے اکثر حقیقت کو فراموش کر کے باطل کے خوگر ہو چکے ہیں محبت کی لذتیں تقریباً ہر ایک "زندہ انسان" نے حاصل کی ہیں لیکن شاید بہت کم انسان ایسے ہیں جو کہ ان لذائذ کی حقیقی شدت کا علم رکھتے ہیں۔ دو خوبصورت آنکھیں ایک سبک پرواز ساعت کیلئے تمہاری طرف ملتفت ہوئیں ۔۔۔ تمہارے سارے نظامِ عصبی میں ایک تیز لرزش پیدا ہوئی اور تم سمجھے "یہ محبت" ہے۔ اب جذبات کے قدم آگے بڑھے۔ تصرف حاصل کرنے کی بے پناہ خواہش پیدا ہوئی۔ کوششیں کی گئیں، حائل مشکلات کو کچل ڈالا گیا اور آخر کار قانون و مذہب نے تمہیں تمہارے مرکزِ محبت کا واحد مالک بنا دیا ۔۔۔ یہ ہے تمہاری محبت کی ابتدا اور انتہا۔ مگر آہ شاید میری محبت کی پرواز بہت بلند ہے۔ اتنی بلند کہ تم اُسے معلوم

کر کے مجھے دیوانہ کہنے لگو گے۔ مگر میں اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ میری فطرت کی صداقت میرے ساتھ ہے۔ میرا ضمیر گونگا نہیں ہوا۔ میری حیات بیجان نہیں ہوئیں ضمیر کے صحیح ارشادات اور حیات کی حقیقی چمک میری حیات محبت کی بنیاد ہے۔ تم مجھے ایسی محبت کی تلقین کرتے ہو جو جذبات جنسی کی دوسری شکل ہے۔ جسے قرب جسمانی کے بعد فطرت رخصت بقا نہیں دیتی —— جس میں تمنائیں ہیں مگر محدود و بے کیف —— جس میں لذتیں ہیں لیکن فانی و شرم انگیز —— نہیں ایسی محبت مجھے نہیں چاہیئے۔ اپنی نگاہوں سے دُنیا کی رسم و راہ کا دبیز پردہ اٹھا دو۔ اور میری محبت کی —— سکون پاش —— لافانی و لامحدود —— خلوت میں چلے آؤ۔ تم فلسفہ سمجھو یا شاعری مگر میں اسے حقیقت تصور کرتا ہوں کہ محبت فنا ہونے کے واسطے ہرگز پیدا نہیں ہوئی۔ تم اگر جذبات جنسی کو محبت سمجھتے ہو تو یہ بھی تسلیم کرو کہ محبت فانی ہے وہ "تصادم نظری" کا وہ پاکیزہ لمحہ جب حسن و عشق دو کو چھوڑ کر ایک ہو جانے کے لئے اولین کوشش کرتے ہیں ایک ایسا لمحہ ہے جو اپنے اندر لازمانی و لامکانی وسعت رکھتا ہے —— زندگی ختم ہو جائے —— بار بار پیدا ہو کر ختم ہو جائے صدیاں مر جائیں۔ مگر یہ لمحہ کبھی نہیں مرتا —— اس لئے فطرت

سلیم کبھی اس چیز کی مقتضی نہیں ہو سکتی کہ اس بیش قیمت لمحے
کو چند ایسی فانی ساعتوں کا پیش خیمہ سمجھ لیا جائے جن کے
اندر نفسانی خواہشات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جسم سے تعلق رکھنے
والی ہر شے ناپائیدار ہے اور روح سے متعلق ہر چیز ابدی
و دوامی —— پھر محبت کے روحانی جذبات کو جسم کی
ناپائیداری میں کیوں محدود کر دیا جائے —— محبت ایک
طلب معصوم ہے روح کی اور روح ایک طالب معصوم ہے
محبت کی!! —— محبت کی یہی نظر تھی جس نے میرے
اور ناہید کے درمیان اوّلین مرتبہ ایک رابطۂ شوق و اعزاز
قائم کیا تھا۔ میں ناہید کی دوشیزگی کے حضور میں جس انداز سے
دوزانو ہوا تھا اس میں ستائش و پرستش کے علاوہ اور کچھ
نہ تھا۔ میں نے اُسے دیکھا اس طرح جیسے ایک لرزہ براندام
پجاری ایک سراپا تمکنت دیوی کو دیکھتا ہے۔ اس کے جمال
کے روبرو میری فطرت کے وہ تمام عناصر جن کے اندر پرستش
کا جذبہ خون بن کر دوڑ رہا تھا ستار کے تاروں کی طرح تھرا گئے میں
نے محسوس کیا کہ میری روح ایک الوہی نغمہ گا رہی ہے اور
فرشتے رقصاں ہیں۔ ہائے زندگی کی وہ ساعت بھلائی نہیں

بھولتی —— سکون تھا فردوسی —— مسرت تھی بے پناہ —— دل اچھل رہا تھا اور زندگی کی ساری قوتیں دل بن جانا چاہتی تھیں۔ نگاہیں متبسم تھیں اور روح کی ساری تمنائیں نگاہ میں تبدیل ہونے کے واسطے آنکھوں میں آ گئی تھیں۔

زمانہ گذرتا گیا اور میں ناہید کی خاموش پرستاری سے اپنی روح کی بالیدگی حاصل کرتا رہا۔ میں ہرگز نہ چاہتا تھا کہ جس درمیانی "بعد جسمانی" نے مجھے اور ناہید کو ایک "قرب روحانی" عطا کیا ہے وہ زائل ہو جائے تم حیران کیوں ہوتے ہو؟ —— میں واقعی ہرگز یہ نہ چاہتا تھا —— میری تمنا تھی تو یہی کہ اپنی ہستی کی ساری قوتیں ناہید کی پرستش پر بے دریغ صرف کرتا رہوں۔ محبت جذباتِ جنسی سے شروع ہوتی ہے —— یہ الفاظ صحیح ہوں یا غلط مگر اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جب فطرت سلیم کی مدد سے روح انہی جذبات کی طاقت کو "مہذب" بنا کر اپنے ماتحت کر لیتی ہے تو محبت ایک تمنا بن جاتی ہے دور سے پوجنے کی —— اور دل چاہتا ہے کہ "پھول" کو توڑو نہیں —— دور سے دیکھتے رہو —— یہی روحانی تمنا تھی جو مجھے شادی سے محترز رہنے پر

مجبور کرتی تھی۔ کبھی کبھی لمحاتِ تنہائی میں یہ سوچتے ہوئے میری روح لرزہ براندام ہو جاتی تھی کہ اگر دنیا کی رسم و راہ نے اس "بعدِ لذیذ" کو مٹا دینے پر مجھے مجبور کر دیا تو میں موت کے سامنے کس طرح خندہ پیشانی کے ساتھ آ سکوں گا۔ سوچتا تھا اور ڈرتا تھا کہ اگر وہ "حسنِ معصوم" جسے ایک مرتبہ دور سے دیکھ لینے پر ہی میرے شوق کی انتہائی معراج ہے کبھی بے محابا اور "شانِ طلب" کے ساتھ نزدیک آ گیا تو میں زندہ رہ کر کافرِ محبت ہو جانے کے الزام کو کیسے برداشت کر سکوں گا۔ مگر آہ شاہد اس کا کیا علاج کہ اگرچہ محبت "دونوں طرف" ضرور ہو جاتی ہے مگر "دونوں طرف" اس کے تقاضہ کے صحیح معنی لازماً نہیں سمجھے جاتے ہیں ایک ہی نظر میں سمجھ گیا کہ ناہید بھی مجھ سے محبت کرتی ہے مگر اپنی محبت کو صحیح روشنی میں سمجھتی نہیں —— یہ واقعہ میری حیاتِ محبت پر پہلی مہلک ضرب تھی۔

پھر شادی ہو گئی —— تم بھی آئے —— دنیا آئی عیش و عشرت کے ہنگامے رہے۔ کیا کچھ نہ ہوا مگر اب تم خود ہی سمجھ لو کہ میں مضمحل و افسردہ کیوں نہ رہتا۔ مجھے تو اسوقت تک مر جانا چاہیئے تھا شاہد! —— آہ تم سمجھے نہیں میری مجبوریوں

کو ——— سچ بوجھتے ہو؟ ——— دنیا بے وقوف بھی ہے اور ظالم بھی ——— کون کہے کہ مراد تو ناہید کے معبد کا پجاری ہے ——— شوہر بننا نہیں چاہتا ——— کوئی کہے بھی تو سمجھے کون؟ میری محبّت کا خون بہا دیا گیا ——— میرے ارمانوں کو جو روح کی امانت تھے جسم کے پاؤں سے بیدردی کے ساتھ کچل دیا گیا۔ کیا تم اب بھی دریافت کرنے کی جرارت کر سکتے ہو کہ تو مضمحل اور وارفتہ کیوں ہے؟ آہ کسی کی زندگی لٹ جائے اور وہ غریب اُف بھی نہ کرے؟ ——— محبّت کا حسین ساز توڑ دیا جائے اور تاروں کی ایک نالہ ساماں جھنکار بھی پیدا نہ ہو؟ ——— شادی کی کند چھری سے گلوئے محبت پر مشق خوں ریزی کی جائے اور فوارۂ خون بھی بلند نہ ہو؟

تمہیں کہو اب شاہد کیا "جذبات کا یہ بیدردانہ خون کیوپڈ اور وینس کو کبھی گوارا ہو سکتا ہے؟"

میرے نظریۂ محبت کو نتیجۂ جنوں سمجھو ——— قہقہے لگاؤ مگر خدا کے واسطے ایک لمحہ سنجیدگی سے غور بھی کر لو۔ میری نہ سنو۔ مجھے تم "عجیب" کہتے ہو۔ اوروں کی تو سُنو جو اس قسم کی محبّت کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر طالمی کہتا ہے:-

"حقیقی محبت کی اعلیٰ ترین صورتیں ایسے حالات میں ظہور پذیر ہو سکتی ہیں جب کہ دماغی اور جذباتی خصوصیات ایک ارتقاء اعلیٰ حاصل کر چکی ہوں۔ ایسے انسان تصرّف حاصل کرنے کی اس قدر پرواہ نہیں کرتے جس قدر کہ "جنسی محبت" رکھنے والے عام طور پر کرتے ہیں۔ وہ لوگ بس اسی پر قانع ہوتے ہیں کہ محبت کریں اور خاموش رہیں —— دور سے ہی پرستاری کرتے رہیں"۔

کارنیٹر لکھتا ہے کہ:۔

"اکثر یہ جذباتی محبّت کسی خاص وجہ سے روحانی محبّت کی ہمہ گیر اثر اندازی میں تبدیل ہو جاتی ہے"۔

روس کا مشہور فلسفی ادیب طالسطائی کہتا ہے کہ:۔

"مرد اور عورت کا فرق جسم تک ہی محدود نہیں بلکہ دیگر اخلاقی (روحانی) خصوصیات تک قائم رہتا ہے جو مرد کو مرد اور عورت کو عورت بناتی ہیں لہذا مرد و عورت کی باہمی کشش صرف "جسمانی قرب" پر ہی مبنی نہیں ہوتی بلکہ اس کشش کا سبب بعض اوقات

وہ متضاد خصوصیات بھی ہوتی ہیں (جو کہ اخلاقی و
روحانی اعتبار سے مرد و عورت میں موجود ہیں، جس
حد تک روحانی محبت کی تسکین ہوتی رہتی ہے اُسی
حد تک جسمانی خواہشات فنا ہوتی جاتی ہیں"

شاید یہ لوگ تو میری طرح دیوانے نہیں۔ پھر یہ کیوں اس قسم کی محبت کو ممکن تصور کرتے ہیں اور تم کیوں اسے دیوانگی سمجھ کر صرف مسکرا رہے ہو؟؟ مجھے ضرورت نہ تھی کہ قلبی معاملات کی پیچیدگی کو سلجھانے کے لئے دماغی مفکرین کے خیالات پیش کروں مگر کیا کروں دنیا سب معاملات کو اسی طرح سمجھنے کی عادی ہے اور دنیا کی رسم و راہ سے تم ابھی تک آزاد نہیں ہوئے۔ اگر چاہو تو ان سب دلائل کو ایک جملہ معترضہ سمجھ لینا اور اپنے احساسات کی معصومیت سے پوچھنا کہ میں کیا کہتا ہوں

میں قنوطیت پرست نہیں —— اور میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ محبت امیدوں کا ایک رنگین تسلسل ہے۔ جو ایک دل سے دوسرے دل تک قائم ہو جاتا ہے۔ جب تک محبت دل میں نور پاش ہے۔ قنوطیت کی تاریکی باریابی حاصل نہیں کر سکتی۔ محبت کرنے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ جو

مایوس ہے وہ محبت کو بھول چکا ہے

میری ساری کتابِ ہستی اب تمہارے سامنے ہے۔ اپنا "راز" میں تمہیں تبلا چکا ہوں۔ سوچو اور سمجھو کہ میری موجودہ کیفیت کس حد تک معقول ہے اور میں کہاں تک اُن فرائض کو انجام دے سکتا ہوں جو دنیا نے مجھ سے "فسادی" کے بعد وابستہ کر دیئے ہیں۔

ناہید ——— آہ ناہید بے شک افسردہ ہے۔ تم جو کچھ بھی کہو درست ہے لیکن شاہد اپنی دیوی کے حضور میں سر بسجود ہونے کے علاوہ سب کچھ بھول چکا ہوں۔ اس کی دوشیزگی کے سامنے میری ہستی کی تمام جرائتیں پڑی کانپ رہی ہیں۔ میں اُسے ایک دفعہ دیکھتا ہوں تو کئی شب و روز کے لئے کھو جاتا ہوں دنیا جو کچھ کہتی ہے کہے جائے۔ دعا کرو کہ میرا قدم جادۂ مستقیم سے نہ ہٹے اور میری محبت ہمیشہ مائل صعود ہی رہے ——— آہ ——

جی رہا ہوں داد ئی عبرت میں یوں
کہہ رہا ہو جیسے افسانہ کوئی

تمہارا   مرآد نامراد

نکہت کے خطوط

پروین پیاری!

کتنے عرصے کے بعد تمہارے جمود میں جنبش پیدا ہوئی ہے! پروین! کیا میری تباہی جذبات کے لئے یہ ناقابلِ برداشت حقیقت کافی نہیں، کہ میں مر نہیں سکتی؟ --- پھر اگر تم ہی اس اذیت میں اضافہ نہ کرو گی، تو میرے دل کا کونسا آنسو دامن پر ٹپکنے سے رہ جائے گا؟ دیکھو یوں ستایا نہ کرو۔ ورنہ پھر میرے صبر و ضبط کو ناتواں کہنے کا حق بھی تمہیں نہ رہے گا۔

تمہاری معصوم محبت ریز تحریر میری نظروں کے سامنے ہے محسوس ہوتا ہے۔ کہ جینے کا گیا گذرا زمانہ مجھے واپس مل رہا ہے۔ خدا کے واسطے اگر یہ احساس صرف فریبِ تمنا بھی ہو تو بھی اسے شدید تر ہی بنائے جاؤ، کیونکہ شعورِ حال کے ساتھ

ساتھ ہی مجھے بالکل یہ معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی میرا گلا دبائے چلا جاتا ہے۔

میری حالت کیا پوچھتی ہو پروین ——— پوچھنے کا وقت تو کہیں کھو گیا۔ اب تو بلا پوچھے رونے ——— اور روئے جانے کا زمانہ ہے۔ آنکھ میں ذرّہ ریگ گر جانے سے جو کرب اور بے چینی ہوتی ہے وہ مستقل طور پر میری روح میں سما گئی ہے، راگ مدھم سروں سے شروع ہو کر ایک خاص بلندی تک پہنچ جاتے ہیں، اور اس بلندی سے پھر خاموشی کی طرف ڈھلکتے چلے آتے ہیں لیکن میری زندگی کا الم انگیز راگ سکوت سے دور ہی ہٹتا چلا جاتا ہے، کون جانتا ہے کہ ابتدا کی طرف رجوع ہو گا یا نہیں!

میں گھبرا گئی ہوں پروین ——— گھبرا گئی ہوں۔ ان المناک ہنگاموں سے!! ——— کاش کوئی بتا سکتا کہ اگر عظمت مآب مشرق کی ایک معصوم و حیا پرست بیٹی، زندگی کے ان محشر خیز طوفانوں میں گھر جائے جن کو روکنے کی قوت وہ استعمال نہ کر سکنے ہی پہ مجبور رہے۔ تو وہ کس طرح موت کی گہرائیوں میں سکون کی تلاش کرے؟

تم کہتی ہو صبر کرو ——— بے حس بن جاؤ "ان" کی طرح

——— یہ کیسے ممکن ہے بھولی پروین! ——— اگر تم نے یہ الفاظ اشک ریزی کی حالت میں نہ کہے ہوتے تو یقین کرو مجھے تمہاری حیات کی زندگی پر بھی شک ہو جاتا ——— تم کیا جانو نگھی، یہ دکھ کیسا جان لیوا ہے!!

رات وہ آئے تھے گھر ——— نہ معلوم کتنی طویل بھیانک راتوں کے بعد ——— بارہ ۱۲ بج چکے تھے۔ میں "جعفر عباسہ" کا مطالعہ کر رہی تھی اُن کے پاؤں کی آہٹ کو میرے دماغ سے پہلے میرا دل پہچان جاتا ہے۔ سینے میں دھک سے ہو گیا اور بے اختیار ایک بار پھر وہی لطیف بے چینی سی محسوس ہوئی جو کہ "اولین مرتبہ" ان کے پاؤں کی آہٹ سننے پر ہوئی تھی، خادمہ کبھی کی سو چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آئے تو میں نے سلام کیا۔ نہ معلوم کتنے عرصہ کے بعد ان کے لبوں پر سلام کا جواب ایک خفیف تبسم کے ساتھ نمودار ہوا، میری کیفیت نہ پوچھو کیا تھی ——— کبھی ہوا کی تیز موجوں میں کسی ننھی پتی کو تھرتھراتے دیکھا ہے تم نے؟

انھوں نے کھانا کھایا ——— میں پنکھا جھلا کی

اور پھر ——— پھر وہ سو گئے! ——— جنگاریوں کو یاد دُں

سے مسل مسل کر بجھانا اسی چیز کو کہتے ہیں پردین!

پھر ایسی راتیں تو بہت گذری ہیں مجھ پر —— تم کہاں تک سنو گی —— پیکے کے بعد میری تنہا ہئوں کو صرف دو ایس ملے ہیں —— کتاب اور ستارے! —— اور دونوں کی غمگساری نے کالی کالی راتوں میں ہمیشہ میری بیداریوں کا ساتھ دیا ہے —— آہ سکھی! اب تو یہ ساری زندگی ہی ایک بھیانک رات ہے۔ جسے جاگ کر کاٹنا ہے، کاش سوسائٹی کی آنکھیں ستارے بن کر میرے سکرات کو دیکھ سکتیں ——

میں ہرگز نہیں کہتی پردین! کہ ان کی عادت میں کوئی اخلاقی عیب ہے۔ وہ نیک ہیں —— پورے پورے نیک —— میری آزادیوں پر کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کرتے اور مادی ضرورتوں میں کبھی مجھے مایوس و مجبور نہیں رکھتے۔ لیکن ہمیشہ کے لئے خادمہ بن جانے کا صلہ ہی کچھ تو نہیں ہو سکتا —— "شریک زندگی" کے مفہوم میں "شریک احساسات" کا پہلو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اور میرے مذاق میں بعد المشرقین ہی سہی —— ان کی اور میری فطرت یکسر بیگانہ ہی سہی۔ لیکن انسانیت کا عنصر اگر مشترکہ ہو تو پردین اسی کے

لئے عورت جنت سے بھی روگردانی کی جرأت کر سکتی ہے۔

ان زخموں کی چبھن کے احساس سے پہلے ہی مجھے اس "روحانی نشتر" کا علم تھا۔ لیکن جب سوسائٹی اور خاندان کی ہمنوائی "مشرقی حیا" بھی کرنے لگے تو لڑکی مر سکتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔ یہ اس کا امتیاز ہے اور باعثِ فخر بھی —— میری نگاہوں کے سامنے وہ لمحات اب تک روشن ستاروں کی طرح موجود ہیں۔ جب میری زبان کی معمولی سی جرأت میرے مستقبل کو تبدیل کر سکتی تھی میں دلہن بنی ہوئی اپنی سہیلیوں کے متبسم حلقے میں بیٹھی تھی، تمام گھر میں خوشی کا شور و غل برپا تھا۔ لیکن میری بی اماں مرحومہ مجھ سے چھپ چھپ کر رو رہی تھیں —— پھر یکایک وہ اہم اور انتہائی اہم لمحہ آ پہنچا جو خدا نہ کرے کہ کسی عورت کی زندگی میں بار بار آئے —— میری مسہری کے برابر آ کر کسی نے مناکحت کی اجازت طلب کی۔ سچ مانو پروینا اس وقت ایک پر زور "نہیں" میرے دل سے تڑپ کر لبوں تک آئی۔ لیکن مسلم دوشیزہ کی فطرت نے مجھ سے کہا —— نادان یہ بولنے کا وقت نہیں رضائے والدین پر سر تسلیم خم کر دینا ہی سرفرازی ہے" —— زبان کو حرکت نہ ہوئی اور معلوم نہیں میرے قریب

سے کس نے وہ سب کچھ کہہ دیا، جو با دلِ ناخواستہ مجھے کہنا چاہیے تھا۔

اس بات کو آج دو سال سے زائد ہو گئے —— اور تمہیں کیا بتاؤں کہ اتنی مدّت تک یوں ہی چپکے چپکے سلگتے رہنے کے بعد اب میری خاکستر حیات میں کیا رہا ہے، جس طرح مجھ سے پہلے میری دو بہنیں ان پر نثار ہو چکیں، اسی طرح میں بھی آہستہ آہستہ اپنی زندگی کی منتخب بہاریں قربان کر رہی ہوں —— آہ

نہ جی سکنا مگر جینا، نہ مر سکنا مگر مرنا
یہی ہے داستانِ دل یہی ہے داستاں میری

مگر میں نے ارادہ کر لیا ہے۔ پروین! کہ اپنی تقدیر سے زور آزمائی کروں گی آخری دم تک —— دیکھنا ہے کہ میری حیات کی تپش ان کے دل تک کب تک نہیں پہنچتی، اگر میں اس جدو جہد میں ختم ہو گئی تو سمجھ لینا، کہ تمہاری برباد نکہت کامیاب رہی اور اس کامیابی کا دلگداز ثبوت خود ان کے آنسو ہوں گے!

پیاری ہمراز! خدا کرے تم اچھی ہو، اور جواب جلد دو۔

سوگوار حیات
نکہت

جانِ نگہت!

تعویق سے شاید تمہیں تکلیف ہوئی ہو پروین! ــــ مگر میں مجبور تھی ــــ اچھا معاف کر دو ــــ اس دفعہ تمہارے اشکوں کے لئے میرا افسانہ بہت مختصر ہوگا۔ لیکن ــــ اگر اس کو کسی رسالہ میں شائع کر دیا جائے تو سماج اپنی ستم فرمائیوں پر اپنا سر پیٹ لے گا!

کئی دن سے مجھے بخار تھا ــــ بخار سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی، بشرطیکہ شدید بھی ہو، کیونکہ اس صورت میں میرے ہوش و حواس معطل سے ہو جاتے ہیں۔ اور مجھے اپنی "آہ و کراہ" کو بھول جانے کا موقع مل جاتا ہے۔

رات بخار بہت شدید تھا اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں انگاروں کے بستر پر پڑی تھی۔ رات بڑی بھیانک تھی۔ بارش زوروں سے ہو رہی تھی، اور بجلی کی کڑک سے دل سہما جاتا تھا! کوئی دو بجے کا وقت تھا۔

خادمہ بے چاری میرے پاس بیٹھی بیٹھی کافی خستہ ہو چکی تھی میں نے اسے سونے کی اجازت دے دی تھی، اب دوسری طرف "وہ" اپنا لمبا کرتا اتارے خراٹے لے رہے تھے۔

یکایک مجھے شدید پیاس محسوس ہوئی، اتنی طاقت نہ تھی۔ کہ صحن کے اس طرف جا کر پانی پی سکتی اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر بیچاری خادمہ ہی کو آواز دی "ان" کو جگانے کی مجال کہاں نہ کر سکتی تھی۔ بارش کا شور ——— میری نحیف آواز ——— پھر خود خادمہ کی بے پناہ نیند ——— نتیجہ یہی ہوا کہ وہ نہ جاگی۔ میری پیاس تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ نہیں کیسے بتاؤں پروین! کہ اس وقت میرے سینے میں کتنے نشتر اترتے جا رہے تھے۔ سوچتی تھی ——— میرے اللہ میاں میں کتنی بدنصیب ہوں۔ شاید مجھے ہی تو میری بی اماں نے اپنے زانو پر سلا سلا کر راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں غالباً میں ہی تو تھی جس کے ذرا سے وہم پر بھائی جان ڈاکٹروں کو پریشان کر دیتے تھے ——— نہیں وہ نگہت تو مر چکی ——— مار ڈالی گئی ——— برباد کر دی گئی ——— اب تو نگہت یہ ہے کہ بخار کے آتشکدے میں تنہا تڑپ رہی ہے اور اگرچہ باہر زمین کا ہر ایک ذرہ بارش کی لطافتوں سے سیراب ہو رہا ہے۔ لیکن اسے ——— اس نگہت کو ——— پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں میں نے بہت چاہا پروین مگر آنسو نکل ہی آئے اور پھر اس وقت تک نہ تھمے۔ جب تک سینے میں لرزنے کی ذرا سی بھی سکت

باقی رہی۔ میں رو چکی تو سکون ہوا، آنسوؤں سے بھیگے ہوئے لبوں کو دانتوں میں دبا لیا۔ کیونکہ سسکیاں دم توڑے ڈالتی تھیں اور پھر یکایک میں نے سوچ لیا کہ اب کوئی آواز نہ دوں گی ——— خواہ یونہی آنسوؤں سے پیاس بجھا بجھا کر مرنا پڑے ——— مگر یہ عزم مجھ جیسی حقیر ہستی کی قوتوں سے کہیں زیادہ تھا۔ تشنگی بے پناہ ہوتی گئی اور آخر کار مجبور ہو کر میں اپنی دکھتی ہوئی کمر اور لرزتے ہوئے ہاتھ پاؤں کے باوجود آہستہ آہستہ صحن کی طرف بڑھی، بوندوں کے خوف سے میں نے چاہا کہ ذرا عجلت سے صحن کو عبور کر لوں لیکن اس ارادے کے ساتھ ہی میرا پاؤں پھسلا اور پروین تمہاری نکہت ——— بے یارو مددگار نکہت ——— گر پڑی ——— یہ معلوم ہوا کہ دنیا ایک دہشت ناک رفتار سے گھوم گئی ہے اور چاروں طرف خوفناک چیخیں بلند ہو رہی ہیں۔

مجھے معلوم نہیں۔ میں وہاں سے کیسے اٹھی یا اٹھائی گئی سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ جس کی گرہ کا انداز یہی بتاتا ہے کہ خادمہ کے ہاتھ سے بندھی ہے ——— چاہتی تھی "ان" سے پوچھ لیتی ——— لیکن پروین! میں نے نہیں چاہا ——— نہ جانے کس خوف سے نہیں چاہا ——— آہ میری معذوری!!

یہ جانتی ہو کہ ان کی یہ بے نیازی ارادی نہیں ـــــــ اور اس لئے ـــــــ ان کے سامنے خود کو مظلوم کہنے کی تمنا بھی پوری نہیں کر سکتی، وہ یہ محسوس ہی نہیں کر سکتے کہ ان باتوں میں بیگانہ وشی کا اظہار میرے احساسات یا کسی کے احساسات کو مجروح کر سکتا ہے ـــــــ اور اس چیز کا راز وہ ماحول ہے، جہاں ان کی فطرت نے پرورش پائی ہے ـــــــ آہ! وہ بالکل معصوم ہیں۔

اچھا رخصت: ـــــــ اب ان کے آنے کا وقت ہے اور مجھے ان کے اہتمام میں لگنا ہے۔ بخار اب بھی ہے اور چوٹ کی وجہ سے سر بری طرح دکھ رہا ہے۔ لیکن اپنی تکلیف کی وجہ سے ان کو بے آرام دیکھنا میں برداشت نہیں کر سکتی ـــــــ تم اسے حماقت کہتی ہو لیکن میرے دل کی زبان میں اسی حماقت کو پرستش کہتے ہیں ـــــــ اور اگر عورت شوہر کی پرستش نہیں کر سکتی تو خدا کی پرستش بھی اس کی قدرت سے بعید ہے۔

تمہاری جاں بلب دوست

نگہت

غمگسار!

کس قدر طویل مدّت کے بعد تمہیں خط لکھنے بیٹھی ہوں

اُف پورے چھ ماہ! —— تم متفکر ہوگی —— میں پشیمان ہوں

تم سوچتی ہوگی کہ نگہت فراموش کار ہے، لیکن شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بعض اوقات جس چیز کو "فراموش کاری" سمجھ لیا جاتا ہے وہ "خود فراموشی" ہوتی ہے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ جس طرح سوسائٹی نے مذہب و فطرت سے بغاوت کر کے میری زندگی کی نوخیز امنگوں کو دیدہ و دانستہ اپنے لغو و مہمل اصولوں پر قربان کر دیا ہے۔ اسی طرح میں بھی "راہ و رسم منزلہا" سے یکسر قطع نظر کر کے گمنامی اور خود فراموشی کو اپنا "سالک" بنا لوں۔ اور اس آگ میں چپکے چپکے ہی سلگ کر راکھ ہو جاؤں لیکن تمہاری غمگساریوں اور لطف پاشیوں کے خلوص نے میرے عزم مستقل کو پھر لغزش دی اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ تم جیسی محبت کرنیوالی ہستی کو بھولنا میرے بس کی بات نہیں۔

اگر مجھے روتے ہوئے دیکھ کر رونے میں تمہیں کچھ اذیت نہیں ہوتی تو ذرا دیر آؤ آج تمہیں خوب خوب رلاؤں، اشک ریزی کی تمام قوتیں مجتمع کر لو اور سب کو خون بنا کر آنکھوں سے

بہا ڈالو کیوں کہ شاید اسی طرح تمہیں صحیح طور پر اس چیز کا اندازہ ہو سکے گا۔ جسے کلیجے کا خون ہو جانا کہتے ہیں۔

آج سے پہلے تم نے مجھے حسین رنگ میں دیکھا تھا۔ وہ اب باقی نہیں رہا۔ میں وہ سب کچھ کر چکی، جو ایک شریف لڑکی اپنی شریک حیات کے جذبات و احساسات کی پاسداری کے لئے کر سکتی ہے لیکن جس طرح یخ کے انبار میں آفتاب کی حدت پیدا نہیں کی جا سکتی اسی طرح ان کی جمود پرور فطرت آج بھی پہلے کی طرح بے نیاز حیات نظر آتی ہے میں تھک گئی ہوں پروین اور میری ساری تعمیری قوتیں بھی بے جان ہو کر گر پڑی ہیں —— پھر اب میں نے کیا سوچا ہے ہاں سوچ لیا ہے اور وہ کچھ جو تم نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہو گا۔ آؤ تمہیں بتلا دوں وہ چیز بھی جو میں بتلانا نہ چاہتی تھی" تم میرے اس عزم کی مخالفت کرو یا موافقت۔ مجھے پروا نہیں مجھے کسی کی پروا نہیں اب پروین!

رسم و روایات کے زہریلے اثرات سے اپنے دماغ کو ایک لمحے کے لئے آزاد کر لو اور سنو —— صید افگنوں کی جانستاں ناوک اندازیوں سے تنگ آ کر ایک مجروح شیرنی کیا کیا کرتی ہے؟ —— ایک گریہ مسکین کو کسی تنگ و تار کوٹھری

یں محبوس کر کے ذبح کرنا چاہو تو اس وقت وہ کیا کرتی ہے؟
کیا کرنے پر مجبور ہوتی ہے؟ بس سوچ لو وہی عزم آخری میں نے
کر لیا ہے۔ اب تک نیائش و پرستاری میں جبین شوق کو خاک
بنائے رکھا اب وہی جھکی ہوئی گردن جذبۂ انتقام کی تمام
خودسری کو لئے ہوئے بلند ہو گئی ہے۔ اب تک انگاروں کی
طرح دہکتی رہی۔ اب شعلوں کی طرح بھڑک اٹھنا چاہتی ہوں،
کبھی تمنا تھی، اور زبردست تمنا، کہ ان کی حیات کی تاریکی میں
اگر ہو سکے تو چاند کی خنک وسیمیں کرنیں جراکر مجتمع کر دوں اُن
کی ذہنیت میں ایک سبک لچک پیدا کر کے وسیع کر دوں لیکن
اب یہ سب کچھ نہیں —— اب میں اسی چیز کو ٹھکرا کر پاش
پاش کر دینا چاہتی ہوں —— محبت کی قوتیں شکست پا چکی
ہیں —— اب انتقام کی باری ہے —— انتقام!
انتقام "ان" سے نہیں —— بلکہ سوسائٹی سے —— اندھی
اور ظالم سوسائٹی کے اندھے اور ظالم اصولوں سے!
تم سراسیمہ کیوں ہوتی ہو پروین —— مجھے مجرم سمجھتی ہو گی تم؟
—— آہ سکھی تمہیں معلوم نہیں کہ اس سوسائٹی کے دیو نے
کتنی بے گناہ ہستیوں کو اپنے خونخوار جبڑوں میں کچل ڈالا

ہے اور ہنوز اس کی تشنگی کو تسکین نہیں ہوئی۔ سینکڑوں معصوم و بے گناہ لڑکیاں اس خونی چکی میں پوری پوری بے دردی کیساتھ پیسی جا رہی ہیں۔ ان کی ہڈیاں چخ چخ ——— کرکے چور چور ہو رہی ہیں۔ ان کی زندگی کا نوجوان خون فوارے کی طرح بلند ہو رہا ہے۔ اور ان کے اعضا پس پس کر گوشت کے گھناؤنے لوتھڑوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ لیکن اس خونی چکی کو چلانے والے قہرمانی ہاتھ پوری قوت کے ساتھ اس خونچکاں شغل میں منہمک ہیں اور اس مہذب دنیا کے مہذب بھیڑیوں میں کوئی اتنی جرارتِ انسانیت نہیں رکھتا، کہ اس قتل عام کیخلاف احتجاجی آواز ——— یا محض ایک خون انگیز چیخ ہی بلند کردے میں پوچھتی ہوں تہذیب و آزادی کے علمبرداروں سے کہ کیا ان کے تمام بلند بانگ دعاوی میں اس مقتل کا دروازہ بند کرنے کا کوئی پروگرام ہے؟ میں سوال کرنا چاہتی ہوں مذہب و ملت کے رہنماؤں سے کہ کیا ان کے اصولوں میں اس قہرمانیت کے خلاف کوئی قوت کار نہیں؟؟

تم جانتی نہیں پروین ——— یہ سارے مہذب ہنگامے پرلے درجے کی منافقت و خودغرضی کی پرورش کے ذرائع

ہیں۔ مرد نے جب کبھی مہذب فطرت کے خلاف کچھ کرنا چاہا ہے تو اسی قسم کے رنگین حجابات کا سہارا ڈھونڈا ہے تہذیب نام ہے اس حجاب نفس پروری کا جس میں ہر غیر فطری اور خود غرضانہ حرکت کو جواز کا لباس مل جاتا ہے ــــــ آزادی کا مقصد ہے اپنے "کام و دہن و نفس" کے ذرایع تسکین کو مہیا کرنے میں کوئی روکاوٹ پیدا نہ ہونے دیا ــــــ عورت ہمیشہ ان مظالم کے ہاتھوں ستائی گئی، مذہب نے اسے آزادی بخشی تو سوسائٹی نے اپنے خود ساختہ اور روائتی اصولوں کے ذریعہ اسے سلب کر لیا۔ آج ہندوستان کے طول و عرض میں کتنی ایسی لڑکیاں ہیں جن کی ازدواجی زندگی کی تعمیر میں خود ان کی منشاء اور رائے کا کوئی دخل ہے ؟ ــــــ والدین سماج کے خوف سے مجبور ہو کر صرف حسب و نسب اور دولت و ثروت کے لئے اپنی لاڈلی اولاد کو اس شرمناک قربان گاہ پر بے دریغ ذبح کر رہے ہیں ان کی ذہنیت میں یہ چیز ہے ہی نہیں کہ شادی صرف اسی وقت جائز ہو سکتی ہے جب طرفین میں محبت اور اگر محبت نہیں تو موافقت ضرور ہو۔ اسی چیز سے آگاہ ہونے کے لئے مذہب نے یہ طریقہ بنایا تھا کہ طرفین سے رائے لی جائے

لیکن ہماری اندھی سوسائٹی اس کا کبھی خیال بھی نہیں کرتی میں یہ نہیں کہتی پروین کہ شادی سے پہلے طرفین کو "کورٹ شپ" کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے ــــــ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ جن کی شادی ہو ان سے ہی رائے طلب کی جائے اور پھر والدین اپنے دسیع تر تجربے کی بنا پر اس رائے پر تنقید و تبصرہ کر کے ایک موافق یا مخالف نتیجہ پر پہنچیں تم ہی کہدو اگر تمہارے دانشمند ماں باپ اس چیز کو مدنظر نہ رکھتے تو کیا پروین تمہاری ازدواجی زندگی اس قدر مسرور کن ہو سکتی تھی ؟ پھر اس کو بھی چھوڑ دو کم از کم اتنا ہی خیال رکھا جائے ــــــ کہ جن لوگوں میں آپس میں نفرت ہو ان کو شادی کے مبارک رشتے میں منسلک نہ کیا جائے ــــــ مگر آہ یہ سب کچھ میں ہی تو کہہ رہی ہوں ــــــ کہے جاؤں ــــــ وہاں کون سنتا ہے؟ سوسائٹی کے ہنگاموں میں درد و کراہ کی ان چیخوں کا کوئی گذر نہیں۔ ہم چلاتے چلاتے اپنے بھیپھڑوں کا خون کردیں تب بھی سوسائٹی کی ظالم دیوی اپنی طرب پسند نظروں کو ادھر نہ اٹھائے گی۔ پروین میری رگ رگ میں طیش و غضب کا التہاب سیماب کی طرح تڑپ رہا ہے۔ اگر مجھ میں قدرت

ہوتی، تو اس پورے عشرت کدے کو زلزلہ بن کر مسمار کر دیتی کاش کسی طرح کوئی کہہ دے کہ اے سماج کے خون آشام درندو! ——— انسانیت کی شرم کرو ورنہ وہ دن بھی قریب ہے کہ ہم مقتولوں کا خون رنگ لائے گا اور فطرت کا سنگین انتقام تم پر نازل ہوگا۔

خط طویل ہوگیا ——— میں نہ جانے کیا کیا لکھ گئی کیا کروں سکھی یہ سیلاب رو کے نہیں رکتا، بھیّا کو اسی برباد نگہت کا سلام کہہ دینا! تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔

تمہاری دکھیا
نگہت

پیاری پروین!

مکتوب محبت زینت نظر ہوا ——— واقعی تم نے خوب خوب دادِ غمگساری دی ہے۔ اس ایک ہفتے میں نہ معلوم کتنی بار اسے پڑھ چکی ہوں، صرف اس لئے کہ رونے کا اور کوئی ذریعہ میسر نہ تھا۔ تم متعجب ہوگی کہ یہ کیا لکھ رہی ہوں ——— مگر تم تعجب نہ کرو سکھی پہلے مجھے "ان کی حرکتیں

دیکھ دیکھ کر صدمہ ہوتا تھا۔ لیکن میری ذہنیت کے ساتھ ساتھ جس کا تذکرہ پہلے خط میں کر چکی ہوں۔ یہ چیز بھی باقی نہیں رہی، اب ان کی باتیں دیکھتی ہوں اور نفرت وحقارت سے ہنستی ہوں۔ جتنا ہنستی ہوں اتنی ہی یہ نفرت بڑھتی جاتی ہے —— پھر مزہ یہ ہے کہ وہ اس نفرت کو بھی محسوس نہیں کرتے۔ اس ہنسنے کو رونا سمجھ لو یا کچھ اور —— بہر حال اب تو ہنسنا ہے، اور اسی قسم کا —— تم میرے ساتھ بہت کچھ رو چکی ہو —— آؤ! اب میرے ساتھ کچھ ہنس بھی لو۔

رات وہ کوئی دس بجے مکان آئے۔ میں حسب معمول کتاب پڑھ رہی تھی۔ دروازے میں قدم رکھنے کے بعد اولین کام انھوں نے یہ کیا کہ کرتا اتار ڈالا۔ اور دوسرا یہ کہ —— "کھانا دیدو بھئی!" میں کتاب پڑھتی رہی۔ ملازمہ نے کھانا اُن کے سامنے رکھ دیا اُنھوں نے بلا پس و پیش تنِ تنہا اپنے کام و دہن کی خاطر داری شروع کر دی اور کوئی نصف گھنٹے بعد بولے دسترخوان میں میرے واسطے اللہ اور اللہ کے رسول کا نام چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ —— پھر بیٹھ گئے اور پانی پی کر ایک بلند بانگ ڈکار لی۔ میں سب کچھ کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی

اب انھوں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کبھی باورچی خانہ کی طرف تو کبھی الماریوں کی طرف کچھ دیر سوچا اور پھر ذرا تلخی انداز میں ارشاد ہوا نہ معلوم کس سے، کہ ـــــ "ارے بھئی ـــــ وہ پرانا گڑ کہاں ہے؟"

میں نے کہا ـــــ "گڑ کیا ہوگا اس موسم میں؟"

انھوں نے فی البدیہہ فرمایا ـــــ "ذرا منہ میٹھا کرنا تھا۔"

ملازمہ نے منہ میٹھا کرایا۔ منہ چلاتے ہوئے میری طرف آئے اور کہا "کیا پڑھ رہی ہو جی تم؟ ـــــ دیکھیں تو۔"

میں نے کتاب ان کے ہاتھوں پر ڈال دی۔ دیکھتے ہی بولے "ارے بھئی! یہ تو انگریزی کی کتاب ہے، ہماری سمجھ میں کیا خاک آئے گی" ـــــ میں نے پوچھا "اچھا اردو کی کسی کتاب کا نام بتائے جو آپ کی سمجھ میں آگئی ہو۔"

وہ مفکرانہ انداز میں اپنا سر کھجاتے ہوئے بولے "الف لیلیٰ" یہ کہا ـــــ اور پھر میری کتاب دیکھ کر بولے ـــــ "ہاں یہ کونسی کتاب ہے بھئی ـــــ نام کیا ہے؟ کس شعبۂ علم کی بات بتاتی ہے یہ؟ اور"

میں نے کہا ـــــ "توبہ! ذرا تھم تھم کر سوالات کیجئے!

آپ نے تو مشین گن کی طرح سوالوں کی بوچھار کر دی ——— سنئے ——— اس کا نام ہے "عورت" اور ایک امریکن مصنف کی تصنیف ہے۔"

انھوں نے ذرا سنجیدہ منہ بنا کر کہا ——— "اس میں کیا لکھا ہے؟"

میں نے فوراً انگریزی میں کہہ دیا "Marriage in order to be valid must be based on love." ———

انھوں نے کہا۔ "بھئی اردو میں ——— اردو میں!"

میں بولی ——— "شادی کی صحت و جواز کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ محبت پر مبنی ہو۔"

یہ سن کر وہ چپ سے ہو رہے، پاندان کے پاس گئے اور پان بناتے ہوئے ذرا بصیرت افروز انداز میں فرمایا:—

"تم انگریزی کی کتابیں نہ پڑھا کرو، ورنہ خیالات خراب ہو جائیں گے؟"

میں نے کہا: "خیالات خراب ہو جائیں گے یعنی ابھی تک میرے خیالات خراب نہیں ہوئے۔ پھر اتنی مدت تک انگریزی کتابوں نے صحت خیالات کو نقصان نہیں پہنچایا، تو آئندہ کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ صرف یہ کہہ کر رہ گئے "منطق میں نے پڑھی نہیں"

میں نے پوچھا "پھر آپ نے پڑھا کیا ہے؟"

ذرا تنک کر بولے "پڑھتے کیا ——— یہی اردو فارسی پڑھی ہے"

میں زور سے ہنس پڑی۔ نفرت کے پورے جذبات کیساتھ مگر وہ سمجھے کہ ان کی لطافت مزاح کی داد دے رہی ہوں ان کی زندگی کا یہ پہلو تم نے نہ دیکھا ہوگا اب تک ——— میں نے بھی اس کو آج سے پہلے اس زاویۂ نظر سے نہ دیکھا تھا۔ پہلے میں ان چیزوں کو دیکھ کر اپنا خون جلتا ہوا محسوس کرتی تھی اور روتی تھی ——— اب ان چیزوں کو اپنے جذبۂ نفرت و استکراہ کا کھلونا سمجھتی ہوں اور ہنستی ہوں۔ یہ بھی میرے انتقام کا ایک پہلو ہے۔

کیا اچھا ہو کہ تم کچھ دنوں کو میرے پاس آجاؤ اور حماقت و نفرت کے اس تصادم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر میرے ساتھ سماج کے زعم معاملہ اندیشی کا مضحکہ اڑاؤ

تمہاری دوست

"نگہت"

(۲)

نشاطِ روح!

تمہارا مکتوبِ شوق ایک ہفتے سے آیا ہوا رکھا ہے۔ اور میں نے صرف اس لئے اب تک جواب نہ لکھا کہ میری "تعویق نگاری" کے متعلق تمہارا جذبۂ شکوہ گزاری کہیں مضمحل نہ ہو جائے جس نامراد قلب کی ضرباتِ پیہم نے کبھی دستِ تسلی کا خواب بھی نہ دیکھا ہو ——— جس بدبخت زندگی نے کبھی اس "سپردگیٔ بے اختیار" کا تجربہ نہ کیا ہو جس کے مقدس وجود کا اعتراف کر کے مذہب و اخلاق نے بھی عورت کے واسطے کچھ دیر کے لئے ترکِ حیا کو گوارا کر لیا ——— اس نامراد قلب اور مجروح زندگی کے لئے ایک محبت کرنے والی ہستی کی شکوہ سنجیاں کیا کچھ ہیں، اس کا جواب تم مجھ سے نہ پوچھو پروین ——— میں چاہتی ہوں کہ خاموش رہوں اور

تم کبھی ہنس کر، کبھی برہم ہو کر اپنی محبت کے ساز سے جھنجھلا جھنجھلا کر شکایات لطیف کی راگنیاں تخلیق کرتی رہو۔ کبھی اپنے معصوم تبسم کی بوچھار میں مجھے شرابور کردو اور کبھی اپنی کیوپڈ کی کمان جیسی محبت آفرین پیشانی پر سیمیں شکنیں ڈال کر مجھے اپنے خلوص کی پوری قوتوں کے ساتھ سخت و سست کہتی چلی جاؤ۔ اور پھر متبسم دیکھنے کی کوشش میں ناکام ہو کر جب تم خود بھی مضمحل ہو کر بیٹھ رہو تو میں اپنے پشیمان آنسوؤں کے درمیان مسکراتی ہوئی تمہاری بلوریں گردن میں اپنے بازو حمائل کردوں!! ——— تم ہنس رہی ہو، پروین؟ میری دیوانگی پر؟؟ ——— ہاں خوب ہنسو ——— ازدواجی خلفشار کے یہ تین گریہ پرور سال، ستاروں اور اشکوں کی موجودگی میں بسر کر دینے کے بعد اب میں بھی ہنسنا چاہتی ہوں۔ آہ! تم جانتی نہیں سکھی، محبت کی اس خلقی تشنگی کو جو انسان اور خصوصاً عورت کے خمیر میں حلول کر دی گئی ہے۔ محبت عورت کا جبلی مذہب ہے اور جس طرح انسان دنیا میں کسی مذہب کا پابند ہوئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح عورت کیلئے اس کا یہ جبلی مسلک ناگزیر ہے۔ عورت کسی حال میں ہو اس کی روح کا یہ مقدس تقاضا ابھار ہو کر رہتا ہے۔ ازدواج سے پہلے وہ اپنی گڑیا کو چاہتی ہے۔

اور اپنے قریب ترین اعزا کو ——— ازدواج پردہ شوہر کی پوجا کرتی ہے اور پھر اپنی اولاد کا پریم ——— اور اس کی محبت کا یہ آخری مظہر ہی بلند ترین شے ہے۔ پھر اگر کوئی عورت ——— پریم کی ماری دکھیا عورت ——— سماج کی ستائی ہوئی نیم جان عورت اپنے شوہر کی نگاہوں کی نرمی اور کیفیت سے اپنی محبت کو ارتقا کے بلند ترین درجے پر پروان نہ چڑھا سکنے پر مجبور کر دی جائے تو تم ہی بتاؤ، کہ وہ تڑپ تڑپ کر خود اپنا گلا نہ گھونٹ لے تو کیا کرے۔ اور اگر مذہب و اخلاق کے قوانین کا احترام کر کے وہ اس جواں مرگی سے دست کش ہو کر زندہ بھی رہے تو اسے خود کو فریب حیات دینے کا ذریعہ تم جیسی بے لوث دوستوں کے علاوہ اور کہاں مل سکتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو لیکن کبھی کبھی اپنی نامرادیوں کے تحت یہ احساس بھی ایک خود فریبی معلوم ہوتا ہے۔ اور تمہاری محبت کا یقین پھر اس وقت تک نہیں آتا جب تک تم اپنے معصوم شکوؤں کا کوئی شیریں و جاں آفریں تیر میرے دل کی گہرائیوں میں پیوست نہیں کر دیتی ہو ——— ایک بے حس چٹان پر ننھی ننھی موجوں کا کیا اثر؟ جب تک کہ کوئی طاقتور سیلاب اس چٹان سے

متصادم نہ ہو!! ـــــ پھر مجھ سے زیادہ بے حس چٹان کا اطلاق اور کس پر ہو سکتا ہے۔ اور تمہاری شکایت ہائے رنگین سے زیادہ اور کس چیز کو طاقتور سیلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

تم پوچھتی ہو کہ میں شعر بھی کہہ لیتی ہوں کہ نہیں؟ ـــــ کتنا معصوم استفسار ہے!! تم نے یہ سوال کیوں نہ کیا کہ تم رو بھی لیتی ہو کہ نہیں ـــــ؟ اس میں کلام نہیں کہ اتنی مدت تک میری دوست اور ہمراز رہنے کے باوجود تم نے میری درد سرائی کو نہیں سُنا، شاید اسی لئے کہ میں خود بھی اسے شنیدنی تصور نہیں کرتی۔ لیکن کیا تم اب تک صرف اس قدر بھی تصور نہیں کر سکیں، کہ نگہت کی زندگی کا ہر نفس ایک تان ہے سوہنی کی ـــــ ایک راگنی ہے کسی برہ کی ماری نیوگنی کی ـــــ یہ حقیقت ہے کہ محبت اور شاعری میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خصوصاً اس قسم کی شاعری میں جسے صرف "میرا بائی" کی نوحہ سرائیوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ـــــ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ نگہت کا قلب اب تک اس لذیذ جسک سی ناموس ہے ـــــ اور اس لئے شاید کوئی کہدے کہ تو شعر کیسے کہہ سکتی ہے۔ لیکن اگر شاعری صرف جذبات حزن وطرب کی ترجمانی ہے تو میں کہوں گی۔ کہ میرے دل سے زیادہ

حزن و ملال اور کہاں ملے گا — میں محبت سے محروم ہوں — صحیح — لیکن اپنے دل میں اس جاں سوز محرومی کا احساس بھی تو رکھتی ہوں کیا احساس جذبات کو برانگیختہ اور لبوں کو مترنم کر دینے کے لئے کافی نہیں؟

بایں ہمہ میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اسے شاعری نہیں سمجھتی میرے پاس ان پریشان خیالیوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ رات کے سناٹے میں — دوپہر کے سکوت میں — شام کی خاموشیوں میں — سوتے جاگتے — دل کی چند دھڑکنیں تڑپ کر الفاظ کی صورت میں لبوں سے باہر نکل پڑتی ہیں۔ جن کے اندر نہ کوئی ربط ہوتا ہے اور نہ کوئی سلسلہ — وزن اور قافیہ کا وجود نہ ہوتا تو میں ان کو نثر ہی کہہ دیتی، خدا جانے یہ کیا ہے؟ — تم مصر ہو تو سنائے دیتی ہوں، مگر صرف یہ پوچھنے کے واسطے تم ان منتشر خیالوں کو کیا سمجھتی ہو — لیکن پہلے یہ خوب سمجھ لو کہ ان نواہائے جذبات کا مخاطب کوئی نہیں، کرب و کراہ کی یہ آوازیں کس کے سنانے کو بلند کی گئیں ہیں اس کا جواب خود مجھے بھی معلوم نہیں — میں نے تو جو کچھ محسوس کیا کہہ دیا۔

رات میرے سر میں سخت درد تھا، اور کسی طرح نیند نہ آتی تھی "وہ" حسب قاعدہ میری تکلیف سے بے نیاز اپنا لمبا کرتا اتارے پڑے سو رہے تھے۔ ان بے چین لمحات میں تنہائی کے احساسات کو دُور کرنے کے واسطے میں نے مجبوراً "..... ....." کا سالنامہ دیکھنا شروع کیا۔ لیکن درد کے باعث ذرا سی دیر میں سر گھومنے لگا۔ مجبوراً رسالہ بند کر دیا، اور چپ چاپ لیٹ گئی۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی وقت کی کیفیات سے متعلق ہیں:۔

یہ کرم بھی کم ہے کیا صیاد کا
قید کی وسعت میں تو آزاد ہوں

آنکھیں آنسو ہیں جاں ہونٹوں پہ ہے
پہلے فریادی تھی اب "فریاد" ہوں

مر رہی ہوں اور مر سکتی نہیں
ہائے اب تک میں تمہیں کیوں یاد ہوں

میری بربادی سے نسبت ہی تمہیں
ورنہ میں برباد ہی برباد ہوں

دل بھی اب رونے لگا ہے اے ندیم
دیکھ لے آنسو میں سرخی آ گئی

تم سے تو اچھی تمہاری یاد ہے!
آئی اور آ کر ہمیں بہلا گئی:

اب کہاں ذوقِ تمنا کی وہ پیہم بارش
اب تو دامن کی طرف دیکھ کے رو دیتی ہوں

تمہیں نہ چاہو تو بتلاؤ پھر کہاں سے آئے
وہ صبر جس کو تمہاری نگہ نے لوٹا تھا
جو لب تک آ کے خموشی میں کھو گئی ہائے
اس ایک آہ میں کس کو خبر ہے کیا کیا تھا

ناچیز آنسوؤں کی اللہ رے قدر و قیمت
ہم حال کہہ رہے ہیں وہ مسکرا رہے ہیں

یہ ہے میری وہ دردسرائی جس کے سُننے کے واسطے تم اسقدر بے تابیوں کا مظاہرہ کر چکی ہو۔ اب تم خود ہی کہہ دو کہ بھلا یہ کوئی سُننے کی چیز ہے؟

"وہ" ! کیسے ہیں؟ ——— اس کا جواب میں دوں تو کیا؟ ——— کاش تمہیں اپنا کلیجہ دکھا سکتی، کہ اس پر کتنے زخموں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے تیر و سناں کی طرف سے اپنے پہلو کو بے حس و سنگین بنانے کی کوشش کرتی ہوں لیکن پھر بھی جمود کی اس تہہ کے نیچے سوئی ہوئی انسانی کمزوری تو دُور نہیں کی جا سکتی۔

ہاں یہ خبر صحیح ہے کہ میں دو بار سینما جا چکی ہوں۔ تم جانتی ہو

پروین کہ میں سینما کے خلاف کس درجہ شدید جذبات رکھتی تھی ـــــ وہ جذبات آج بھی موجود ہیں۔ میرے نزدیک سینما آج بھی ایک مخرب مذاق اور دشمن اخلاق چیز ہے۔ لیکن جس طرح ایک جاں بلب مریض کے واسطے شراب کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ لہو و لعب اور نشاط نفسی کے ذرایع میرے واسطے کھل گئے ہیں۔ پھر میں وہاں اس لئے نہیں جاتی کہ فلم کی عشوہ فروش ادا کاریوں سے محظوظ اور اس کے افسانے کی عیش پرستیوں سے متکیف ہوں ـــــ حاشا ہرگز نہیں ـــــ باور کرو میرے واسطے تو سینما کے پر تکلف ہال اور ایک قبرستان میں بیٹھنا برابر ہے۔ آہ ـــــ سماج کے خوں ریز اصولوں نے میرے مسرت و تفریح کے تمام جذبات کو ذبح کر ڈالا جب عورت کے پہلو میں اپنے شوہر کی بے حسی اور بے نیازی ہمیشہ ایک خون آشام کانٹے کی طرح کھٹکتی ہو، وہ سینما کی تفریح سے کیا حظ اندوز ہو گی؟

ـــــ شوہر عورت کا دیوتا ہے۔ اور جب یہ دیوتا ہی ایک پتھر کی مورتی بن جائے۔ تو پھر ساری دنیا بھی تبسم ہی تبسم بن جائے تو کیا ـــــ آہ! پردیں

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

کہو ہمارے بھیا تو اچھے ہیں نا؟ ——— ان کے پارہ ہائے جذبات سُنے ہوئے تو مدت ہو گئی۔ اگر احساساتِ رشک اجازت دیں تو میرا اسلام کہدینا ان سے۔

تمہاری نگہت

سرمایۂ انبساط!

خوب ہے ——— قسم کھاتی ہو، کہ اب کبھی شکوہ نہ کرو گی گویا یہ جواب دیا ہے تم نے میری محبت کی ان بے چارگیوں کا جو تمہاری شکایات کو میرے لئے باعثِ تسکین بنائے ہوئے ہیں؟؟ ——— تم بہت شوخ ہو جلی ہو پروین! اگر ان معصوم شرارتوں کا یہی ارتقار رہا تو مجھ جیسی نحیف و زار کے پاس تو تڑپنے کی بھی سکت نہ رہے گی شاید سٹیونس نے کہا تھا ——— " محبت کرنا کچھ نہیں، محبت کیا جانا البتہ کچھ ہے، مگر محبّت کے بدلے محبت کیا جانا سب کچھ ہے ——— " اور اب غالباً تم اسی "سب کچھ" کو حاصل کرکے پندار پرست ہو گئی ہو، ہاں ضرور ہو جاؤ، مگر اتنا خیال کر لو۔ کہ آخر دنیا کا یہ نظام بھی قائم رہنے دو گی یا نہیں؟ مصر کی ماہ جبیں ملکہ قلو پطرہ نے احساسِ جمال کے نشہ میں بدمست ہو کر

سلطنتوں کو ٹھکرا کر پامال کر دیا اور سینکڑوں جوانیوں کو صرف یک لمحی نشاط کی خاطر زہر کے جام پلوا دیئے —— خدا نہ کرے کہ تم قلوبطرہ بنو۔ لیکن کیا میری زندگی کو بھی تم انطونی کی طرح مسحور کر دینا چاہتی ہو، اور اس قدر مسحور کہ میں سب کچھ چھوڑ کر تمہاری ہو جاؤں اگر خدا ناکردہ یہی ارادہ ہے تو میرے علاوہ خود تمہارے "ان" کا —— بس اللہ ہی بیلی ہے۔ شاعر تو وہ پہلے ہی سے ہیں —— اور تم جانتی ہو، کہ شاعری سے آگے دوسری منزل مجذوبیت ہی کی ہے!! —— یہ کوئی ہمارے وہ نہ باشد کہ "زمیں جنبد زماں جنبد نہ جنبد گل محمد"۔ —— آیا عقل شریف میں ؟

افسانے ؟ —— جی ہاں افسانے مجھے بہت محبوب ہیں میری نظریں رسائل میں اولیں کام یہی کرتی ہیں کہ افسانے تلاش کریں تم نے یہ تذکرۂ تاسف چھیڑا ہے۔ تو اب صاف صاف بھی سُن لو، رسائل میں یہ بلاناغہ شائع ہونے والی داستانیں جن کو "افسانہ" کہا جاتا ہے۔ بجا نوے فی صدی خرافات سے زیادہ نہیں ہوتیں تم خود جانتی ہو کہ افسانہ جب تک حیات انسانی سے مربوط نہ ہو فنی لحاظ سے "افسانہ" نہیں ہو سکتا۔ ہمارے

افسانے حیات انسانی سے مربوط تو ہیں، مگر صرف اس شعبۂ حیات میں جس کے جذبات سے بیخود ہو کر نغمہ سنجیاں کرنا ایک ترقی یافتہ قوم ہی کو زیب ہے۔ ہمارے افسانے صرف واردات محبت کی ترجمانی کرتے ہیں اور وہ بھی بعض اوقات پست ترین انداز میں —— یہی وجہ ہے کہ تم بلا مبالغہ ہر ایک افسانے کا مطالعہ کئے بغیر ہی یہ بتا سکتی ہو۔ کہ اس میں ایک ہیرو ہو گا۔ ایک ہیروئن دونوں میں سے کوئی ایک محبت کرے گا یا دونوں —— اور انجام ہو گا شادی یا موت پر!! —— یہ ہے وہ عالمگیر خاکہ جس پر اردو کے کم و بیش تمام تر افسانے محیط نظر آتے ہیں —— یہی سبب ہے کہ اِن میں یکسانیت اور یک رنگی ہوتی ہے —— تنوع نہیں —— جس طرح زندگی کا کوئی ایک واقعہ ایک شاعر سے اشعار موزوں کرا لیتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک افسانہ نگار کے قلم کو کہانی تخلیق کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لہذا یہ ظاہر ہے کہ ایک کامیاب افسانہ زندگی کے کسی حقیقی یا قیاسی و امکانی واقعہ کی تفسیر ہونا چاہئے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ اگرچہ زندگی کا کوئی ایک واقعہ دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہوتا۔ مگر ان واقعات کی یہ افسانوی تصویریں بالکل ایک دوسرے کا عکس معلوم ہوتی

ہیں ـــــ کیوں ؟ ـــــ صرف اس لئے کہ ہمارے افسانے بہت کم زندگی کے حقیقی یا امکانی واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں، افسانہ نگاروں میں مشاہدۂ حیات اور تنقید زندگی کی اہلیت ہی نہیں، حالانکہ ایک افسانہ نویس کے لئے تنقید حیات کا فرض اتنا ہی لازم ہے، جتنا کہ دیکھنے کے لئے آنکھیں ـــــ اگر کوئی چاہے تو کیا ہمارے سماج کے حدود میں افسانہ نویسی کے لئے کچھ کم سامان موجود ہے؟ معصوم دوشیزہ لڑکیوں کے خشک حلقوم پر خاندان اور بزرگوں کی عظمت کا تیز خنجر رکھ کر جب ازدواج کے سلسلے میں جبراً وقہراً "ہاں" کہلایا جاتا ہے ـــــ جب رسوم کی قربان گاہ پر مذہب و اخلاق کے صحیح اصولوں کو بھینٹ چڑھانے کے لئے انتخاب شوہر کے معاملے میں مشرق کی حیا پرور دوشیزہ کی خاموشی کو نیم رضا سمجھ لیا جاتا ہے ـــــ جب صرف دولت اور وقار نسبی کے لئے سماج نوجوان ہستیوں کی زندگی خود ان کے والدین کے ہاتھوں ہمیشہ کے واسطے برباد کر دیتا ہے ـــــ کیا اِن تمام مواقع کے اندر افسانہ نویس کو اپنے قارئین کی ضیافت و بصیرت کا کوئی سامان نظر نہیں آتا؟ ـــــ اس میں شک نہیں کہ افسانے کے واسطے کم از کم میرے خیال میں "محبت" ناگزیر ہے۔

افسانہ نویسی ایک فنِ لطیف ہے - اور تمام فنونِ لطیفہ جمالیات کے اظہار کا آلہ ہیں - لیکن اس میں کلام نہیں کہ جو افسانہ صرف عاشقانہ انجام پر ختم ہوتا ہے وہ خواہ قارئین کے جمالیاتی ذوق کی تشنگی فرو کر دے لیکن "نقادِ حیات" ہونے کے اہم ترین فرض کو انجام نہیں دے سکتا -

توبہ! ——— میں نہ جانے کیا کیا لکھ گئی - تم کہتی ہوگی عجب دیوانی ہے ایک بات پوچھ کر دامن چھڑانا دشوار ہو گیا -

میں افسانہ لکھتی ہوں یا نہیں ؟ ——— واہ! یہ تمہیں خوب سوجھی! افسانہ نگاری پر میں نے اردو اور انگریزی کی چند کتابیں ضرور دیکھی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں خود بھی کوئی کہانی تخلیق کر سکتی ہوں

آہ میری زندگی تو خود ایک جانگداز افسانہ ہے، قدرت کے قلم کا ——— اور اسے تحریری صورت میں پہنچنے کے لئے بھی اُردو افسانہ نگاروں کی ذہنیت کے انقلاب کی ضرورت ہے -

"نگہت پریشاں"

(۳)

رات کہیں دور کوئی گا رہا تھا:-

کون سنے گا اس کا درد شورشِ کائنات میں
تم نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

میں سنتی رہی چپ چاپ ——— اور متعدد بار دل نے کہا تو بھی گا، اور یونہی گاتی ہوئی رات کی خاموش فضاؤں میں اپنی آواز کے ساتھ تحلیل ہوجا ——— مگر میں سنتی رہی خاموش، جیسے کوئی اپنی روح کی کراہ کو سُن رہا ہو، جگر میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ لب تھرتھرائے۔ میں نے محسوس کیا، الفاظ خاموشی بن کر ٹپک رہے ہیں۔

"درد" ——— "شورش کائنات" ——— "پردۂ التفات" ———
اچانک مجھے احساس ہوا، کہ ایک چیخ اپنے ساتھ میری ساری

زندگی بتے ہوئے سینے کی گہرائیوں سے آندھی کی طرح اُٹھی ضبط کی مضمحل کوششیں آنسو بن کر آنکھوں میں آگئیں۔ جسم کے سارے اعصاب فولادی سختی کے ساتھ شل سے ہونے لگے —— میں نے چاہا چیخ پڑوں مگر ایک جانستاں کپکپی کے ساتھ ساتھ معاً یہ معلوم ہوا جیسے کسی آہنی بازو نے پوری بے دردی سے میرا گلا دبا دیا ہے۔ میرا سانس گھٹنے لگا —— ایک ساعت کے واسطے اس گھٹے ہوئے سانس نے نگاہ بن کر آنکھوں سے نکلنے کی کوشش کی مگر دوسرے لمحے ہی میرے ہوش وحواس سلب ہو چکے تھے۔

آخر شب کے ستارے ڈوبنے لگے تھے۔ کہ مجھے ہوش آیا جسم کی رگ رگ زخم کی طرح دکھ رہی تھی۔ ضعف ونقاہت کی شدت میں یہ احساس ہوتا تھا کہ سکرات کے عالم میں زندگی کا دھندلا سا خواب دیکھ رہی ہوں۔ تکیہ سر کے نیچے سے پھسل کر زمین پر آرہا اور چوڑیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے دونوں کلائیوں کو مجروح کر چکے تھے —— مگر —— قریب ہی اپنی مسہری پر "وہ" اسی طرح مدہوش سو رہے تھے !!

یہ "وہ" تھے جن کو مذہب کے پس پردہ سماج نے میرا "خدائے مجازی" بنایا تھا، اور جن کی ہر ایک جنبش نظر پر مجھے صرف سجدے

ہی نثار کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ یہ وہی "ناخدائے ننگ وناموس" تھا جس کے بغیر عورت صرف "عورت" رہتی ہے ——— "خاتون" نہیں! ——— یہ وہی "آقا" تھا، جو اپنی ہر ایک کنیز کو قبر میں سلا کر تہذیب وسماج کے "تاجروں" سے ایک اور "کنیز" خرید لینے کا کلی اختیار رکھتا ہے ——— مگر نہیں ——— وہ تو ایک "لاش" تھی، جس کے کفن میں مجھے اس لئے ساتھ ——— ملفوف کر دیا گیا تھا، کہ اس کے توسل سے میں بھی کسی طرح فردوس میں پہنچ سکوں، ورنہ بدبخت عورت تو مرد کو "مردود بہشت" کرا ہی چکی ہے اور اس کے لئے وہاں تک پہنچنے کا بذات خود کوئی استحقاق نہیں رہا!!

میں نے ایک نظر ادھر ڈالی اور پیچ وتاب کھا کر رہ گئی میرا جی چاہا کہ اٹھ کر اپنے ناتواں ہاتھوں کی ساری قوت ان کی موٹی گردن پر صرف کر دوں، خواہ اس کے بدلے مجھے ابد تک جہنم کے شعلوں میں ہی کیوں نہ جھونک دیا جائے!

تم شاید متعجب ہو گی، کہ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی میں کیونکر ایسا لکھنے کی جرأت کر رہی ہوں۔ لیکن برا نہ مانو، تو کہوں، کہ تمہارا یہ استعجاب غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ تم اس غلامی کا احساس اس لئے نہیں کر سکتیں کہ تمہیں اس کا موقعہ ہی نہیں ملا، تمہاری ازدواجی

زندگی ان تمام مسرتوں کی حامل ہے۔ جن کی "تمہیں" یا کسی اور عورت کو توقع ہو سکتی ہے۔ اور اس طرح اس "حسین و جمیل قید" میں آزادی کا تصوّر بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ مگر مجھے دیکھو، کہ دلہن بننے کے بعد آہوں اور آنسوؤں کے درمیان ہی زندگی گذری ہے۔ اور سماج کی ستم پسند مصلحتوں نے مجھے ان مسرتوں سے فریب کھانے کا بھی موقع نہیں دیا، جو مجھے اپنی صنفی غلامی کے شعور سے دُور رکھ سکتی تھیں اگر ایسا نہ ہوتا، تو بہت ممکن تھا، کہ کسی اور عورت کی زبان سے یہی الفاظ سُن کر میں خود بھی تمہاری طرح متحیّر ہوتی۔

اس غلامی و آزادی سے میرا مفہوم کیا ہے۔ یہ شاید تم پوری طرح نہ سمجھ سکو۔ تہذیب و سماج نے عورت کو کچھ ایسے خوبصورت انداز میں دھوکے دیئے ہیں۔ کہ ایک مبہم سے احساس کے علاوہ کوئی تجزیہ و تحلیل ممکن معلوم نہیں ہوتی۔ عورت کے ارتقائے حیات کی داستان کا اولین باب وہ ہے۔ جب وہ شادی کے بعد بھی اپنے خاندان، یا قبیلہ کے ہمراہ غاروں، یا خیموں میں زندگی گزارتی تھی دُنیا کے اس قدیم دور میں شادی کا مفہوم یقیناً موجودہ مفہوم سے کہیں زیادہ مختلف تھا ابھی تہذیب و مذہب کی پیدائش نہ ہوئی تھی۔ اور اگر ان کا کوئی وجود تھا، تو وہ بھی یقیناً آج کل سے بالکل جداگانہ نوعیت

رکھتا تھا۔ اس لئے موجودہ صدی کا مہذب انسان اس قدیم دور کو وحشت و بربریت کا زمانہ سمجھتا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ اس قدیم "وحشی زمانے" میں عورت کو جو مرتبہ اپنے اقتدار و اہمیت کے لحاظ سے حاصل تھا، وہ آج ——— "یوٹوپیا" کا ایک حسین خواب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں پہلی قابل غور چیز یہ ہے کہ عورت کو اپنے خاندان کا "سردار" تسلیم کیا جاتا تھا وہ شادی کے بعد بھی اپنے اعزا کے درمیان زندگی بسر کرتی تھی۔ اس کا شوہر بھی اس کی طرح اپنے قبیلے میں ہی رہتا تھا۔ اگر کبھی وہ اپنے شریک حیات سے ملنا چاہتا تھا تو اس کی حیثیت عورت کے خاندان میں ایک معزز مہمان کی ہوتی تھی۔ ایک طویل مدت تک یہی قانون جاری و ساری رہا اور شادی کے مفہوم کے زبردست تغیرات کے بعد بھی عورت کی حیثیت اپنے خاندان کی "فطری ملکہ" کی سی رہی۔ اس عہد میں عورت کی اہمیت و رفعت کی شاہد ایک دوسری تاریخی حقیقت یہ ہے، کہ حسب و نسب کا سلسلہ ماں کی طرف سے شمار ہوتا تھا اور تمام رشتے مادری شجرے کی بنا پر متعین ہوتے تھے، ماں خانگی املاک کی مالک تھی۔ اگر عورت کسی سبب سے اپنے شوہر سے بیزار ہو جاتی تھی تو اس کو اپنے گھر سے نکال دیتی تھی اور مرد

اپنے قبیلے میں چلے جانے پر مجبور ہوتا تھا۔ اس قسم کی مفارقت و علیحدگی کی حالت میں بچے اپنی ماں کے پاس ہی رہتے تھے اور اسی کے خاندان کے ارکان شمار ہوتے تھے۔ سماجی ارتقا کے اس دور کے متعلق کار پینٹر بیان کرتا ہے کہ:-

"ان قدیم سماجی حالات میں عورت بہ نسبت موجودہ زمانے کے کہیں زیادہ آزاد و خوش حال تھی - وہ اپنے ہی فرقے یا قبیلے اور اپنے اعزاء و اقارب کے ساتھ رہتی تھی۔ اور اس کا شوہر ایک خارجی مہمان کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان امور کے مدنظر عورت کسی صورت میں بھی شوہر کی محکوم نہ تھی۔ اور اگر شوہر اس تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تو اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ صرف عورت ہی کے لئے پسندیدہ رویہ اختیار نہ کرے۔ بلکہ عورت کے خاندان کے لئے بھی خوشگوار ثابت ہو۔ وہ اپنے بچوں کی کلی طور پر مالک تھی۔ اور اس کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنی ملکیت اپنے بچوں کے واسطے ورثہ میں چھوڑ جائے۔ مختصراً یہ کہ خاندان اور نسب کا پورا اعزاز اسی کو حاصل تھا۔ اس کے برعکس اگر شوہر کو یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ اس کے بچے کون سے ہیں تو اس صورت میں بھی وہ ان کی دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا اور نہ اپنے قبیلے کی اجازت کے بغیر اپنی ملکیت بچوں

کو دیدینے کا حق رکھتا تھا۔ اس طرح ازدواجی زندگی میں مرد محض ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ داستان ہے اس زمانے کی، جسے آج ہم "دہشت و بربریت" کی یادگار سمجھ کر حقارت سے دیکھنے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ جیسے جیسے مرد زندہ مخلوق کی دنیا میں اقتدار حاصل کرتا گیا، اور وحشی جانوروں پر اپنے آلات حرب کی ایجاد کے ذریعے تسلط و قدرت پاتا گیا اس کے ذہن میں ذاتی تصرف کا شعور بڑھتا چلا گیا! اور کچھ مدت کے بعد وہ اپنی ازدواجی زندگی کی پابندیوں کو قہر و غضب کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرد میں اپنی طاقت کا احساس پیدا ہوا اور اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ اپنی قوت کے ذریعے جنگل کے درندے کو ہلاک کر سکتا ہے، اسی طرح وہ اپنی ازدواجی زندگی کے قدیم قوانین کو درہم برہم کر کے عورت کو اپنا محکوم بنا کر چھوڑے گا — یہ اس کا پہلا اقدام تھا موجودہ تمدن کی طرف!! — چنانچہ اس نے اپنے اسلاف کی تمام روایتوں سے بغاوت کی! اور عورت کو ایک جانور کی طرح گرفتار کر کے اپنے قبیلہ کے خیموں میں لے آیا۔ عورت نے اس تباہ کن تبدیلی کو کس طرح قبول کیا؟ یہ چیز وثوق کے ساتھ نہیں بتائی جا سکتی۔ اگرچہ یہ امر انسانی فطرت کے منافی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ عورت محض معذوری و مجبوری کے تحت خاموش ہو کر رہ گئی ہو۔ کچھ محققین کا خیال ہے۔ کہ عورت نے جدید طرزِ زندگی کے نقصانات کو اس لئے برداشت کر لیا کہ اس صورت میں مرد پر اس کا تصرف زیادہ مکمل

اور براہ راست ہونے کا امکان رکھتا تھا۔ بہر حال خواہ عورت نے اس تغیر کو کو پسند کیا ہو، یا نہ کیا ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے، کہ مرد نے اسی پر زور دیا، اور کامیابی کے واسطے اکثر قوت و تشدد کا استعمال کیا۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قسم کی جبری یا گرفتاری کی شادیاں عام ہو گئیں جس مرد میں جتنی زیادہ جرأت رندانہ" ہوئی وہ اتنی ہی عورتیں دیگر قبائل سے پکڑ لایا قبیلوں کے طاقتور سردار اور وحشی جنگجو اپنی بیویوں کی تعداد میں اضافہ کرتے چلے گئے! ور قبائل کے درمیان ایک مستقل خصومت و جنگ کا عنوان قائم ہو گیا۔ اس حالت میں مرد نے عورت کی اقتصادی قیمت کو سمجھا اور اسے مختلف کام سپرد کئے گئے۔ اسکے بچے مرد کی ملکیت ہو گئے۔ اولاد نرینہ کی وقعت بڑھ گئی۔ کیونکہ لڑکے مرد بن جانے کے بعد قبیلہ کی باہمی لڑائیوں میں صف آرا ہو سکتے تھے۔ لڑکیوں کے فرائض یہ رہ گئے کہ زراعت کریں، اناج پیس کر تیار کریں کھال کے کپڑے بنائیں اور بچے پیدا کریں۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی مرد کے اس احساس نے کہ عورت اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ ایک قدم اور بڑھا دیا۔ یعنی دوسری ملکیت کی طرح عورت کی بھی خرید و فروخت جاری ہو گئی، اولاد کے متعلق اس کے تمام حقوق سلب کر لئے گئے۔ حسب و نسب کا سلسلہ مرد کی طرف سے شمار ہونے لگا اور خاندان کی تمام ملکیت جو زیادہ تر خود عورت کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہوتی تھی، مرد کے تصرف میں دے دی گئی

اسی طرح عورت بہت سرعت کے ساتھ ایک "سردار" اور ملکہ کی حیثیت سے گر کر صرف ایک غلام یا پالتو جانور بن کر رہ گئی۔ مادری اعزاز فنا ہو گیا پدری اقتدار کا عروج ہوتا گیا —— مرد ایک آقائے مطلق —— عورت اس کی کنیز!!

عورت کے سماجی مرتبہ کے اس انقلاب پر غور و فکر کرتے ہوئے بہت کم لوگ ایسے ہونگے، جو عورت کی اقتصادی اہمیت کو نظر انداز کر سکیں۔ زوجہ اپنے شوہر کی محض ایک "جنسی شریک" یا اس کے اولاد کی خادمہ ہی نہ تھی بلکہ وہ خاندان کی محنت و مشقت کا زیادہ حصہ سر انجام دیتی تھی، اور مرد کا کام صرف شکار کرنا یا دشمنوں سے جنگجوئی کرنا تھا۔ شکار کے جانوروں کی کھالیں بنانا اناج پیسنا کوٹنا۔ کھیتوں میں ہل چلانا۔ یہ سب امور عورت ہی کی ذمہ داری پر تھے۔ اور اس لئے مرد، عورت کو اپنی ملکیت میں سب سے زیادہ قیمتی چیز سمجھنے لگا، اور اس کی قیمت بھیڑ بکریوں کی صورت میں متعین ہونے لگی۔ اگر عورت ایک کار آمد مزدور نہ ہوتی —— اگر وہ صرف ایک عیش و عشرت اور مصارف کی چیز ہوتی تو یقیناً نسل انسانی کے اس کٹھن اور مشقت انگیز دور میں اس کی قیمت اس قدر زیادہ کبھی تصور نہ کی جا سکتی۔ اس طرح رسمی

شادی کے اس دور نے جہاں عورت کو ایک جدید رتبہ اور اختیار دے دیا۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ عورت کی مساوات اور آزادی کو بھی لوٹ لیا۔ اور اسے ایک کنیز میں تبدیل کر دیا۔ لیکن تم جانتی ہو، کہ جب کوئی انسان دوسروں کو غلام بناتا ہے، تو وہ اپنی گردن کو بھی ان زنجیروں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد دُنیا نے دیکھا۔ کہ مرد عورت کو محبوس کر کے خود بھی آزاد نہیں رہا۔ اس نے خود کو چند جدید اور اہم ذمہ داریوں میں گرفتار کر لیا۔ اس کو مجبوراً چند حقوق اور فرائض کی تکمیل اپنے سر لینی پڑی۔ علاوہ ازیں مرد نے اعصابی طاقت سے حکومت کی۔ اور اس کی اولاد نرینہ "فطری انتخاب" کے قوانین کے تحت اسی ذہنیت کو لے کر پیدا ہوئی، عورت کمزور تھی۔ اس لئے مجبوراً اسے چالاک ہونا پڑا، اور اس نے اپنی لڑکیوں کی فطرت میں تعلیم و عمل سے یہی چیز پیدا کر دی، پھر چونکہ ذہانت وحشیانہ طاقت کے مقابلے میں بتسرط مہلت ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔ اس لئے عورت نے رفتہ رفتہ خود کو "حقوق" روایات و رسوم میں محصور کر لیا۔ جن کی پابندی اکثر مذاہب نے بھی مرد کے واسطے لازمی قرار دے دی۔ نسل انسانی کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم

رسم و قاعدہ جو عورت نے اپنی آزادی کے واسطے قائم کیا۔ یہ تھا کہ شوہر اپنی بیوی اور بچوں کی محافظت و پرورش کا ذمہ دار ہے۔ اس رسم نے رفتہ رفتہ قوت مجتمع کر کے مذہب کی پشت پناہی بھی حاصل کر لی اور ایک قانون کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرح بہت سے محققین کا فیصلہ ہے کہ قدیم انسان اور موجودہ مہذب اقوام کے بیشتر طریق و رسوم عورت کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ تہذیب و تمدن کے عروج کے ساتھ ساتھ یہ طریق اصول میں تبدیل ہو گئے اور مذہب و حکومت کی حمایت نے ان کو قوانین کی صورت دے دی۔ جو کسی حد تک عورت کی آزادی کے ضامن ہو گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم چیز بھی قابل غور ہے۔ انسان کے جسمانی ارتقار کی تاریخ بتاتی ہے۔ کہ اس کے بعض کارآمد اعضار ایسے بھی تھے۔ جن کا استعمال کسی وجہ سے ترک کر دیا گیا اور اس لئے وہ معدوم ہو گئے۔ مگر ان متروک اعضار کے باقیات Vestigial Remnants نظام جسمانی میں اب بھی موجود ہیں۔ جو بعض اوقات عمل میں آ کر غیر متوقع پریشانی کا سبب ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح قدیم زمانے کے نفسیاتی اور سماجی "باقیات" بھی مرد کی فطرت میں خوابیدہ رہ گئے ہیں جو

اکثر متحرک ہو کر اسے مجبور کر دیتے ہیں۔ کہ اپنی تہذیب کے تمام لبادوں کو اتار کر پھر "وہی وحشی آقا" بن جائے۔ جو عورت کو ایک پالتو جانور سمجھ کر اپنی اعصابی قوت سے ہانکتا تھا۔ عورت نے چند بلند فطرت اور وسیع نظر مشاہیر کی امداد سے صدیوں کی جدوجہد کے بعد رفتہ رفتہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو واپس لینے میں۔ ایک نمایاں کامیابی حاصل کی ہے مگر جب مرد کی بہیمانہ خوابیدہ فطرت جاگ پڑتی ہے۔ تو مذہب و تہذیب اور قانون کوئی بھی عورت کی سپر نہیں بن سکتا۔ بلکہ یہی چیزیں مرد کی چیرہ دستیوں کے خوبصورت حجابات ثابت ہوتی ہیں۔ کارپنٹر کہتا ہے کہ "ایک نیم ارتقا یافتہ مرد یقیناً ایک خونخوار جانور ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں مرد کی حکومت کا مفہوم صدیوں تک عورت کی غلامی رہا ہے۔"

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیب و اخلاق کے موجودہ عظیم الشان انقلاب و عروج کے زمانے میں بھی اس قسم کے "نیم ارتقا یافتہ" مردوں کی کمی نہیں۔ ہمارا موجودہ سماج اسی نوعیت کے خونخوار انسانوں کا ایک غول ہے۔ ذرا خود سوچو، کہ جب والدین اپنی بے زبان لڑکی کو ایک "عفریت" کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ اس دوشیزہ کی زندگی

کو اپنے ظالم دبے درو جبڑوں میں کچل کر پھینک دیتا ہے تو گیا یہ منظر بالکل وہی نہیں ہوتا، جب مرد ایک صیاد تھا قہرمان اور عورت ایک صید تھی مجبور و کمزور ——— مذہب و تہذیب کے وہی علمدار جو عورت کو اطاعت و مجبوبیت کا درس دینے میں تقریر کی ساری قوتیں صرف کر ڈالتے ہیں۔ اس وقت کیوں زبان نہیں ہلا سکتے۔ جب عورت کو اسی اطاعت و محکومیت کے بدلے صرف ٹھوکریں عطا کی جاتی ہیں ——— تم نہیں جانتی؟ تو سنو ——— یہ ساری تہذیب کم از کم عورت کے واسطے ایک منافقت" کے علاوہ کچھ نہیں۔ مرد ان قوانین و اصول سے تو انکار نہیں کر سکتا۔ جو غلام عورت نے جدوجہد کر کے اپنی نجات کے واسطے پیدا کئے۔ کیونکہ اس طرح خود" تہذیب" کے دعاوی باطل ہوتے ہیں۔ اب صرف یہی صورت عمل باقی رہ جاتی ہے کہ مرد کہے کچھ اور کرے کچھ۔ عورت کی مساوات و آزادی کے ترانے بھی گائے۔ اور گھر کی قید میں اسے آنسو بہانے پر بھی مجبور کرے ——— اس کی بہبودی کی خاطر اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی ظاہر کرے۔ اور اس کی بربادیوں پر ذرا سی توجہ بھی گوارا نہ کرے ——— آہ! قومیں اسی طرح تباہ ہوتی ہیں!!

خط بہت طویل ہو گیا۔ تم میری بکواس سے یقیناً اکتا گئی ہو گی مگر میں کیا کروں، پروین دکھا ہوا دل ہے۔ اور تم جیسی بے لوث پرستش کرنے والی ہستی ——— ! کہنے بیٹھتی ہوں، تو جی چاہتا ہے کہ ابد تک یونہی کہتی چلی جاؤں، تم چاہے سُنو، یا نہ سُنو! ——— میرے ہذیانات سے یقیناً تم متحیر و متوحش ہوتی ہو گی، مگر پروین مجھے اپنی نامرادیوں کی قسم یہ سب حقائق ہیں۔ شاید میری زندگی میں وہ دن نہ آتے۔ مگر یہ چیز اٹل ہے کہ ایک روز یہ حقائق پرستاری کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے اور میری روح ہندوستانی عورتوں کے خواب میں آکر انھیں مبارکباد دیگی!!

میری صحت کو کیا پوچھتی ہو راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی ایک چنگاری ہے۔ کچھ راکھ بن چکی ہے اور کچھ بنتی جا رہی ہے غشی اور تشنج کے دورے پڑتے ہی تھے اب کبھی کبھی دیوانگی کا سا جوش بھی طاری ہو جاتا ہے۔ تنہا مکان ہوتا ہے اور میں اسی حالت میں دیواروں سے سر ٹکراتی پھرتی ہوں۔ کیا کروں زمین سخت ہے اور آسمان دُور ——— بس چلتا تو کبھی کی مر چکی ہوتی زندگی کے ساتھ ساتھ موت بھی تمسخر کر رہی ہے۔ خدا جانے کب تک یونہی نزع کی اذیت سے کھیلنا پڑے گا؟

تمہاری نگہت،

میری بکھی ؟

آؤ آج تمہیں ایک دلچسپ کہانی سناؤں۔ مجھے معلوم نہیں دوسروں کی زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے یا نہیں۔ کم از کم میری حیات میں تو یہ چیز آپ بیتی ہے۔

کالج کا انبساط پرور زمانہ تو تمہیں بھی یاد ہوگا۔ مجھے تو بھلائے نہیں بھولتا۔ تعلیمی مشاغل میں مستقل انہماک اور اس کی معصوم لذتیں —— بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ زندگی اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہمارے ذہن میں مستقبل کے متعلق کیسے کیسے سہانے خواب محفوظ تھے —— یہ ہوگا، وہ ہوگا —— دن اس طرح بسر ہوں گے —— راتیں یوں گزریں گی —— مگر میرے تو وہ سارے خواب تقدیر کی چٹانوں پر گر کر چور چور ہو گئے کبھی کبھی ان کے ٹکڑے مجتمع کر کے ایک شکستہ سا خاکہ بنانے کی کوشش کرتی ہوں اور پھر خود ہی منتشر کر دیتی ہوں —— کتنا لاحاصل ہے یہ کھیل —— مگر کس قدر دلچسپ!!

آہ انسانی فطرت! —— زندگی بھر ہم سب یونہی خوابوں سے کھیلتے رہتے ہیں —— کچھ خواب زندگی بن کر ایک ہنگامی فریب دے جاتے ہیں، اور کچھ اشکوں، کراہوں اور سسکیوں

میں تبدیل ہو کر اب بھی حقیقت بن جاتے ہیں — مگر ان کی یاد؟
— آہ! وہ تو بار بار آتی ہے — آتی ہے —
خاموش رات میں سونے سے کچھ پہلے — سنسان دوپہر کی
"تنہائی میں — سوگوار شام میں — آتی ہے اور دبے پاؤں
چلی جاتی ہے — جیسے زندگی — آہ! فانی انسان! اتنی
مختصر ہے تیری ہستی، مگر کس قدر لامتناہی ہیں تیرے خواب" !!
پھر اب اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے کہ تو اپنی محرومیوں سے
کھیلتا رہ، کہ اس میں کامرانی نہیں، تو فریبِ کامرانی تو ضرور موجود ہے

ہاں تو یہ اسی "عہد بہاریں کا واقعہ ہے۔ کالج کا عظیم الشان
ڈراما" اندھی دیوانی" ہونے کو تھا جب مجھے تمثیل کے مرکزی
کردار" دیوانی" کا پارٹ دیا گیا۔ تو میں نے سوچا" خوب
یہ ایک ہی رہی! — قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند" بھلا یہ
کیسے ممکن تھا کہ مجھ جیسی بھلی چنگی لڑکی سینکڑوں حاضرین کے سامنے
ایک پاگل عورت بن کر ساری رات بکواس کرتی رہے؟ میں نے
اپنا پارٹ زبانی یاد کر لیا، اور آخری" گرینڈ رہرسل" کا وقت
آیا۔ کالج کا تمام عملہ موجود تھا، رہرسل شروع ہوا، میں دیوانی
بن کر بال بکھرائے دریدہ کپڑے پہنے آگے بڑھی مگر کس قدر

سنجیدگی سے میں اداکاری میں جذب تھی کہ ناگہاں میری نظر اپنی شریر سہیلی "عفت" پر پڑی۔ میری اداکاری نے اس کے چہرے پر حیرت و خوف کے کچھ ایسے مضحکہ خیز آثار پیدا کر دیئے تھے کہ میں دیکھ نہ سکی اور بے اختیار قہقہہ لگاتی ہوئی سٹیج سے بھاگ گئی۔ ایک لمحہ میں سارا کھیل ختم ——— پھر کیا کچھ برہمی و غیض ——— کا ہدف مجھے بنایا گیا۔ کتنی کچھ ہدایات کی گئیں۔ مگر سچ مانو مجھے پھر بھی یہ خوف رہا کہ ڈرامے کے دوران میں کہیں پھر ایسا ہی نہ ہو جاوے۔

مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اگلے روز پورے ڈرامے میں مجھے ایک ساعت کے لئے بھی ہنسی نہ آئی۔ حاضرین نے میرے کمال کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے اور اختتام پر مجھے بہت سے تمغے عطا کئے گئے۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں کھیل میں اتنے مکمل طور پر دیوانہ بن جانے میں کیسے کامیاب ہو گئی تھی۔ میری ترکیب بہت سادہ تھی۔ مگر قدرے دشوار بھی ——— یعنی صرف یہ کہ تمثیل کو حقیقت سمجھ لوں میں نے تھوڑی دیر کے لئے یہ تصوّر کر لیا تھا کہ میں واقعی

ازدواجی زندگی میں داخل ہو گئی ہوں اور میرے شوہر کی بے اعتنائیوں نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔

لیکن پروین مجھے اس وقت کیا خبر تھی۔ کہ یہ ڈراما نہیں بلکہ تمثیل کے پردوں میں اپنی حقیقی زندگی کا کھیل کھیل رہی ہوں۔ اس وقت میں نے جن جذبات کو زبردستی اپنے اوپر طاری کر کے حاضرین سے خراج تحسین وصول کیا تھا۔ آج وہی جذبات میری رگ رگ کو مجروح کر چکے ہیں۔ مگر زندگی کے سٹیج کے تماشائی کس قدر بے حس ہیں کہ چپ چاپ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ کاش یہ "ڈراما" بھی جلد ختم ہو جائے اور موت کا آخری پردہ مجھے ان سنگدل تماشائیوں کی نظر سے مخفی کر دے!!

ہاں تم تعجب نہ کرو ——— میں واقعی روز بروز پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔ دیوانگی کے دورے میں کیا کیا کچھ بکتی ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن یہ جانتی ہوں، کہ اس حالت میں اپنے لاڈے بچے نوری کو کئی بار زدوکوب کر چکی ہوں۔ وہ کیا جانے کہ ماں اس وقت دیوانی ہے ——— سمجھتا ہوگا کیسی

ظالم عورت ہے مجھ سے دہشت محسوس کرنے لگے تو کیا تعجب ہے۔ ہوش آتا ہے تو اسے کلیجے سے لگاتی ہوں ——— پیار کرتی ہوں، روتی ہوں ——— ہنستی ہوں۔ وہ مجھے متحیر نظروں سے گھورتا ہے۔ کبھی کبھی رو پڑتا ہے ——— "امّی ہم نہیں بولتے تم سے" ——— آہ! میرا مظلوم بچہ!! اس کی پیاری پیاری انکھڑیوں میں کیسے ننھے ننھے آنسو جھلک آتے ہیں!! وہ کیسی لرزہ خیز سسکیاں لے کر خاموش رہنے کی کوشش کرتا ہے!!

میرا ننھا سا چاند!!! شاید وہ اس عقوبت میں صرف اس واسطے مبتلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ایک عورت کی لڑکھڑاتی ہوئی زندگی کا واحد سہارا ہے؟ ——— خیر!!

خو گرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

تمہاری نگہت دیوانہ

تراجم

اعادہ

ذیل کا مختصر افسانہ جسے جائز طور پر ایک "شعر بلیغ" کہا جا سکتا ہے ٹیگور کے قلم کی تراوش نادرہ ہے اور غالباً اولین مرتبہ اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی اولین امتیازی حیثیت یہ ہے کہ وہ شاعر ہے اور غالباً "شاعروں کا شاعر" لیکن اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ اپنی موجودہ عالمگیر شہرت صرف اپنے افسانوں کی قوت سے بآسانی حاصل کر سکتا تھا اسکے تمام افسانوں کی فنی خوبیوں کا تجزیہ اس جگہ ممکن نہیں تاہم ادبی بصیرت رکھنے والوں کی نگاہیں اسکے اس مختصر ترین شاہکار میں ان چند خصوصیات کو نظر انداز نہیں کر سکتیں —— (۱) فنی باریکیوں کا اخفا جو بذات خود ایک فن ہے (۲) رومانی زاویۂ نظر جو معمولی مظاہر حیات کو بھی ہمارے تصوّر کے لئے بے پایاں بنا دیتا

ہے (۳) ایک محسوس "حُسن اور ایک خواب مگر عظمت
آب جمال جو افسانے کی ساری فضا کو یکسر "ساحر" بنا
دیتا ہے (۴) حیرت انگیز ایعازی (
اہلیت اور کم سے کم الفاظ کا استعمال ۔۔۔۔ افسانہ
کا فسوں کارحسن بلاشبہ اسٹیونسن جیسا ہے اور کرداروں
کی گفتگو میں پر اسپیرد کا تنفس محسوس ہوتا ہے"

(۱)

جنگ کی خبریں اس روز موافق ثابت نہ ہوئی تھیں اور بادشاہ
اپنے باغ کے اندر اُداس و تنہا چہل قدمی میں مصروف تھا۔
کچھ دور ۔۔۔۔ درخت کے نیچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی
بہت انہماک کے ساتھ کسی کھیل میں مشغول تھے۔ بادشاہ اُن کے
پاس گیا اور پوچھا ۔۔۔۔ "آج کیا کھیل کھیل رہے ہو تم؟"
"رام اور سیتا جی کا بن باس" بچوں نے جواب دیا۔
بادشاہ ان کے نزدیک بیٹھ گیا اور ان کا کھیل دیکھنے لگا۔
لڑکا درختوں کی سوکھی شاخوں کا ایک انبار اُٹھا کر لایا اور
لڑکی ایک بغیر آگ کے چولھے پر کھانا پکانے لگی
سیتا جی اب بن میں رام کے لئے کھانا تیار کر رہی ہیں، وہ بولی "لیکن راون

کہاں ہے جو سیتا کو لیجائیگا؟" بادشاہ نے کہا "آؤ ہم آج تمہارے کھیل میں داون راکشش بن جائیں۔"

لڑکے نے نہایت غور سے اسکی طرف دیکھا ——— اس کے بلند و بالا متناسب جسم اور اس کی خمیدہ مونچھوں کی طرف ——— اور پھر پُر شبہ لہجے میں بولا ——— "لیکن تم مجھ سے ہار جاتے پر بُرا تو نہ مانو گے؟"

"واہ! مجھے تو ہارنے کا بڑا شوق ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا "چاہو تو آزما دیکھو۔"

راون کی موت کا کھیل اس قدر پر لطف ثابت ہوا کہ رام کے جذبہ انتقام کی تسکین کے لئے بادشاہ کو کوئی بارہ مرتبہ مرنا پڑا۔

ڈوبتے سورج کی کرنیں خدا کی برکتوں کی طرح بچوں پر رقصاں تھیں اور بچے روشن قہقہوں کی طرح چمک رہے تھے۔

بادشاہ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور واپسی پر اُس نے وزیر سے پوچھا ——— "یہ دو بچے کس کے ہیں؟"

"لڑکی میری بیٹی رو ہنیرا ہے" وزیر نے جواب دیا "اور لڑکا ایک غریب برہمن پروہت کا اکلوتا بیٹا کوسک ہے"

"میں چاہتا ہوں کہ یہ بچے بڑے ہو جائیں تو شادی کے ذریعہ ان دونوں کو ایک کر دیا جائے" بادشاہ نے حکم دیا۔ وزیر نے پریشان ہو کر سر جھکا لیا ——— وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا!

(۲)

بادشاہ کا ہر لفظ قانون تھا۔ چنانچہ ملک کے سب سے عقلمند و عالم شخص کو طلب کیا گیا اور تعلیم کے لئے دونوں بچے اس کے سپرد کر دیئے گئے۔ دوسرے بچے جو اس سے پڑھتے تھے سب امرا کی امراء کی اولاد تھے اس لئے کوسک کی صورت کسی کو بھی پسند نہ آ سکی۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ مدرسے میں اس سے نفرت کرنے والوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر وہیرا تھی۔ اگر کوسک کسی کتاب کو چھو لیتا تو وہ اُسے پھینک دیتی اور کوسک کی زبان میں بولنے سے بھی عار محسوس کرتی تھی۔ اُس نے ایک دن اپنے گرد سے یہ بھی وعدہ کر لیا کہ وہ کوسک کو ہر بات میں مات کر کے چھوڑے گی — اور اس کی اسی فتح میں کسی شبہ کا امکان بھی واقعی نہ تھا۔ وجہ یہ ہے کہ کوسک اپنا وقت کتابوں سے زیادہ درختوں اور پھولوں کی صحبت میں گذارتا تھا۔ دلفریب سرسبز پہاڑوں کا حسن و جمال اس کے لئے کتابوں کے الفاظ کی تاریک خلوت سے کہیں زیادہ مسحور کن تھا۔

(۳)

دن مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے اور مہینے سال میں

آخر کار بادشاہ نے گرد کو طلب کیا اور پوچھا "تمہارے شاگردوں میں کون سب سے اعلیٰ ہے؟"

"روجیرا" سن رسیدہ پنڈت نے بلا پس وپیش جواب دیا۔

"اور کوسک نہیں؟" بادشاہ نے انتہائی حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"مجھے خیال نہیں کہ اُسے سورج کے طلوع وغروب کے اوقات کے علاوہ اور کچھ یاد ہو!" گرد نے جواب دیا۔

"میرا ارادہ تو ان کی باہمی شادی کا ہے"۔ بادشاہ نے اُمید انگیز لہجے میں دبی آواز سے کہا۔

پنڈت کے لبوں پر ایک خفیف تبسم جھلکنے لگا اور اس نے کہا حضور! اُن کی باہمی شادی تو ایسی ہی ہو گی جیسے شام گرامی افسردگی میں صبح بہار کی تازگی کا پیوند"

بادشاہ نے وزیر کو بلایا اور کہا — "عجلت سے کام لو روجیرا اور کوسک کی شادی میں زیادہ توقف نہ ہونے پائے"

"لیکن میری لڑکی تو اس پر قطعی رضامند نہیں" وزیر نے کہا!!

بادشاہ کو غصہ آگیا اور اس نے درشتی سے کہا — "جب عورتیں 'نہیں' کہتی ہیں تو اُن کا مطلب 'ہاں' ہوتا ہے مگر خیر — فوراً ایک مجلس مقابلہ منعقد کرو۔ دیکھیں دونوں

میں کون علم کے لحاظ سے تفوّق رکھتا ہے۔ اگر کوسک اس پر فتح پا جائے گا تو شادی بھی ہو کر رہے گی"۔

(۴)

"مقابلہ" کا دربار لگا ہوا تھا اور رُوجیرا اور کوسک منصفوں کے سامنے بالمقابل کھڑے تھے۔ کوسک نے آج سے پہلے رُوجیرا کے الفاظ پر کبھی اُنگلی بھی نہ اٹھائی تھی۔ اس لئے گرو کی حیرت و پریشانی کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ یہ دُبلا پتلا نازک نوجوان نہایت شیریں مقالی کے ساتھ اپنے حسین حریف کے عمیق دلائل کو قطع کرتا ہوا صاف نکل گیا۔ اس قطعی غیر متوقع شکست پر رُوجیرا کا گلا خشک ہو گیا اور وہ پسینے میں یوں شرابور ہو گئی گویا جون کی سخت دھوپ میں کھڑی ہے۔

بادشاہ کے لبوں پر اطمینان کا تبسم چمک اُٹھا۔ اس نے مُنجّم کو بلایا کہ شادی کی تاریخ متعیّن کر دے۔

رُوجیرا کی آنکھیں برسات کے بادلوں کی طرح آنسوؤں سے معمور تھیں اور اس کا گرو اس کی تشفی و تسکین کی خاطر کچھ کہنے ہی کو تھا کہ دفعتاً کوسک اپنی نشست سے اٹھا اور ملتجی انداز میں بولا ـــــ "میرے بادشاہ! مجھے معاف کر کہ اس وقت میں

تیرے احکام کی تعمیل سے قاصر ہوں۔ جو چیز ایک شخص کے لئے شیریں ہے وہی دوسرے کے لئے تلخ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے میرے پاس صرف میری "فتح" رہنے دے اور اس "فتح کا انعام" کسی اور کو عطا کر دے"

یہ فاتحانہ فیاض دلی گرو کے جذبۂ پندار کے لئے ناقابلِ برداشت چیز تھی۔ اس لئے اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ اگلے سال ایک اور مجلس مقابلہ کی جائے اور اُسے بالکل آخری و فیصلہ کن سمجھا جائے۔

(۵)

کوسک نے مدرسے کو خیرباد کہہ دیا۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور گھنے سایہ دار جنگل اب اس کی جولانگاہ تھی۔ جہاں وہ بجلی کی طرح کوندتا نظر آتا تھا——ادھر روچیرا کی تعلیم پر گرو پوری محنت و توجہ صرف کر رہا تھا۔

لیکن نہ جانے کیوں روچیرا اپنی ساری دماغی یکسوئی کھو بیٹھی تھی گرو اُسے بار بار یاد دلاتا تھا کہ اگر وہ اسی طرح کھوئی ہوئی سی رہی تو بھرے دربار میں ایک اور توہین برداشت کرنا پڑے گی۔ مگر اس کا اثر کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روچیرا اپنی شکست

کو خود نہایت تمنّا کے ساتھ دعوت دے رہی ہے۔ وہ اب اکثر آسمان کی نیلمیں وسعتوں پر پیاسی پیاسی نگاہیں ڈالتی اور آنسو ——— بے معنی آنسو ——— نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگتے۔

اُسی زمانے میں وزیر نے بادشاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ روجیرا کی شادی بھاؤ دت سے کردی جائے جو کہ بالکل نوجوان تھا اور شہر والوں میں سب سے اعلیٰ۔

"لیکن تمہاری لڑکی اس کے متعلق کیا کہتی ہے؟" بادشاہ نے پوچھا

"جب عورتیں 'نہیں' کہتی ہیں تو اُن کا مطلب 'ہاں' ہوتا ہے" وزیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ صحیح ہے" بادشاہ نے کہا "لیکن کیا اُس کے آنسو اس امر کے شاہد نہیں کہ سونا کھوٹ سے پاک ہو کر نکھر چکا ہے؟"

وزیر نے اپنا سر جھکا لیا ——— وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا!!

(۶)

بادشاہ باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ روجیرا آئی اور اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"روجیرا!! ——— اُس کا دن کا کھیل ——— سیتا بن باس کیا یاد ہے تجھے؟" بادشاہ نے محبت سے لبریز آواز

میں کہا: "میری طبیعت بہت چاہتی ہے رو چیرا کہ وہی سیتا بن باس پھر کھیلیں آج!"

رو چیرا کا نازک جسم جذبات سے کانپ رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں تک ساری کا پلّو اٹھا کر رہ گئی۔

"رام بھی موجود ہے اور بن بھی اب تک وہی ہے" بادشاہ نے کہا "لیکن رو چیرا اس کھیل میں سیتا بننے والا کوئی بھی نہیں کیا تو سیتا نہ بنے گی میری بچی؟" —— رو چیرا کے آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا۔ اُس کا کنول جیسا چہرہ بادشاہ کے قدموں پر آ رہا اور اس کی سسکیوں نے اس کا دل کھول کر رکھ دیا ——

"لیکن دیکھ رو چیرا اس دفعہ راکشش راون میں ہرگز نہ بنوں گا" بادشاہ نے اُس کے سر پر پیار سے تھپکیاں دیتے ہوئے کہا "اب میرے بجائے راون بننے کی باری تیرے گرو کی ہے!"

ترجمہ (ٹیگور)

مصوّر کا نظریۂ محبّت

"فانی مسرتیں نہ اُسے نصیب ہیں اور نہ اُسے اُن کی تلاش ہے ——— وہ تو اپنے خیالات کی ویران وسعتوں میں بس جانے والی "صورتوں" سے محبّت کر کے اپنی روح کو بالیدہ کرتا رہتا ہے۔ جھیل کے پانی میں منعکس آفتاب کی شعاعیں اگر پودوں کی جوانی سے کھیلنے والی شہد کی زرد مکھیوں پر رقصاں ہیں تو ہوا کریں ——— وہ ان کو صبح سے شام تک دیکھتا رہے گا اور دیکھنے کی کچھ بھی پروا نہ کرے گا

بایں ہمہ وہ قدرت رکھتا ہے کہ اپنی اشیا کے ذریعہ زندہ انسان سے بھی زیادہ زندہ صورتیں اور لافانی مخلوق پیدا کر دے"

"شیلے"

ڈاکٹر آرام کرسی پر بیٹھا تھا اور اپنے سامنے لیٹے ہوئے مریض کے عجیب و غریب مرض پر غور و خوض کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی نگاہیں اوپر اٹھتیں اور اُن بے شمار تصاویر کا سرسری جائزہ لیتی ہوئی جن سے کمرہ مزین تھا ایک ایسی ناتمام تصویر پر جا کر مرکوز ہو جاتیں جو ہنوز تصویر کشی کے چوبی چوکھٹے میں آویزاں تھی۔ کمرہ مختلف رنگ کے پردوں سے آراستہ تھا۔ چوکھٹے کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر مصوّر کا موقلم اور رنگ کے ڈبے یوں منتشر اور گرد آلود نظر آتے تھے گویا ان کو مدّت سے استعمال نہیں کیا گیا۔ مریض کو ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے کھڑکیاں نہایت احتیاط کے ساتھ بند کر دی گئی تھیں۔ صرف ایک کھلی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک سبک ریشمین پردہ آویزاں تھا جو شام بہاراں کی نم بردوش ہوا کی نرم نرم موجوں میں تھرّا رہا تھا۔ مریض کی حالت نہایت خوفناک مگر رحم طلب نظارہ پیش کر رہی تھی۔ وہ اپنے کوچ پر دراز تھا اور اس کی جلد کی سطح میں سے اس کی اُبھری ہوئی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

یکایک مریض اُٹھ بیٹھا اور ڈاکٹر کی طرف کچھ ایسی ملتجی نگاہوں سے دیکھا گویا کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ ہوا تو مریض نے ایک ملول آمیز لرزہ براندام آواز میں کہنا شروع کیا:

"آپ جانتے ہیں کہ میں ایک مصوّر ہوں۔ عہدِ جوانی سے ہی مجھے یہ پرجوش آرزو تھی کہ اپنے حریفوں پر سبقت لے جاؤں اور اُن کے مقابلے میں صرف میری تصاویر کے خریدار ہی زیادہ نہ ہوں بلکہ فنی مقابلوں اور نمائشوں میں بھی اُن سے بلند مرتبہ ثابت ہوں لیکن اس سے پہلے کہ میری یہ تمنّا پوری ہوتی مجھ پر ایک عجیب و غریب بیماری حملہ آور ہوئی اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر میرے حواس پر چھانے لگی۔ ایک قسم کا جمالیاتی نشاط میرے دل میں ڈوب کر رہ گیا اور میں "حسن" کے واسطے ایک زبردست تشنگی محسوس کرنے لگا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خود میری روح ایک ناممکن الحصول مجسمۂ حُسن و محبّت کی طرف بے اختیار کھنچی جا رہی ہے۔ جذبات و احساسات کے خوابیدہ چشمے اُبلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

میں متلاشی تھا حُسن کا ——— "حُسنِ کمل" کا!!

تصوّر و تخیّل جو بذاتِ خود مصوّر کے دل کے لئے شیریں ہوتا ہے میرے دل کے واسطے ایک دوسری دنیا بسا رہا تھا ——— خوابوں کی دنیا!! ——— میں اپنے دار العمل میں شب و روز ایک غیر شعوری و نیم مدہوشی کیفیت میں مصروف کار رہتا تھا لیکن اپنی تصاویر کو ——— اپنے تصوّر کے نقوش کو کاغذی لباس میں منتقل

کرنے کے بعد فوراً جاک کر ڈالتا تھا ——— یہ نقوش "حُسن مکمل" کی تصاویر ثابت نہ ہوتے تھے۔ جمال مکمل کا نمونہ مستقل طور پر میرے دل کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا مگر میری تصاویر اس کی ترجمانی نہ کر سکتی تھیں۔ دماغی خلا کے اندر غیر مرئی پردے پر وہ تصویر ہمیشہ رقصاں محسوس ہوتی تھی لیکن افسوس میں اُسے سطح قرطاس پر منتقل نہ کر سکتا تھا۔" مصور کا سانس پھولنے لگا اور وہ خاموش ہو گیا۔

(۲)

"جب اوّلین مرتبہ وہ بصارت پر طلوع ہوئی تو وہ ایک
حور تھی مسرت کی جو مسرت آفریں انداز میں یکا یک ظاہر ہوئی
اور ایک حقیر ساعت کو ساری دُنیا کی آرائشیں دے گئی
وہ ایک تصویر تھی رقصاں ایک مجسمہ تھی خنداں
——— جس کا مقصد آفرینش ہی یہ تھا کہ مدہوش کر دے
——— چونکا دے ——— اور پھر لوٹ لے"

(ورڈس ورتھ)

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہوئی۔ اس کی آواز بوجھل ہو گئی اور بھرّانے لگی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی روح کی فضا میں کھنچ رہی ہے۔ ڈاکٹر آگے جھکا ہوا تھا اور اُس کا ہاتھ ایک

آبنوسی میز پر تھا۔ جس پر تھرما میٹر اور چند خالی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں، مصوّر نے کہنا شروع کیا۔

"ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں اپنے دریچے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہری ہری گھاس۔ فاصلہ پر کلیسہ کی بلند چوٹی اور غرباء کی بے شمار جھونپڑیاں سب کچھ غروب ہونے والے آفتاب کی زرد شعاعوں میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میں ان کو کھوئی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ایکایک مجھے اپنی پشت کی طرف لباس کی سرسراہٹ محسوس ہوئی میں نے مڑ کر دیکھا تو اُسی چیز کو اپنے نزدیک پایا جس کی جستجو مجھے مدت سے بیتاب کئے ہوئے تھی۔ جو "تصویر" میرے دل میں بسی ہوئی تھی وہی اب گوشت و پوست کے سانچے میں ڈھل کر میرے سامنے آگئی تھی۔ "حسن لانہایت" کا وہ پرتو جو میرے دماغ کی فضاء میں ایک رنگین خواب کی طرح رقصاں رہتا تھا اب ایک حسین دوشیزہ کے تناسب قامت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جمال کمل کا وہ نمونہ جسکو اپنی ان آنکھوں سے دیکھنے کی کوئی اُمید مجھے نہ تھی اب میرے سامنے تھا۔

یکایک وہ میری محبوبہ تصور کی ایک حقیقی زندہ تصویر تھی یا صرف میرے دلی احساسات کی ایک تخلیق اور میری دماغی نگاہوں کا ایک فریب ہے ——— اُس کو دیکھ کر بالکل وشبہ یقین نہ آتا تھا

کہ زندہ مخلوق ہے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک خواب کے علاوہ کچھ بھی نہیں ..... تصوّر کی ایک فریب آمیز تخلیق اور بس ——— لیکن مشاہدہ یقین دلا رہا تھا ——— وہ میرے سامنے تھی اور تبسم بر لب خراماں خراماں میری طرف آ رہی تھی۔ وہ پیازی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ جو پریشان گیسوؤں میں در نقاب تھا شرم و حیا اور دیگر عمیق احساسات کی غمازی کرتا نظر آتا تھا ——— وہ آئی اور ہلکے سے میرے شانوں کو چھو دیا میرے منجمد و بے حرکت جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ ہوتا ہے جب دماغ شدید احساسات کے زیر اثر ہوتا ہے تو ایک معمولی چیز بھی تصوّرات کی دنیا میں قیامت بن جاتی ہے ——— "کیا آپ براہ کرم میری تصویر بنا دیں گے؟" وہ مترنم آواز میں بولی میں نے ایک منٹ خاموش رہنے کے بعد جواب دیا:

"ضرور"

"کتنا معاوضہ لیں گے آپ؟"

"بہتر یہ ہے کہ یہ معاملہ تصویر بن جانے کے بعد طے کیا جائے۔"

"لیکن کم از کم ......"

میں کھڑا ہو گیا اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں اپنی نظریں

غرق کرتے ہوئے بولا :-

"میں آپ سے کچھ معاوضہ نہ لوں گا"

میں اس کی طرف پرشوق کیفیت میں دیکھتا رہا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ خدا جانے یہ احساس حیا تھا یا جذبہ برہمی کہ اس کے رخساروں پر یک لخت سرخی دوڑ گئی اور وہ بے حجابانہ میرے پاس سے جانے لگی میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ زمین میرے قدموں کے نیچے سکڑ رہی تھی۔ اس سے پیشتر کہ میں اُسے واپس بلاؤں وہ دروازے میں غائب ہوچکی تھی

کتنی جمیل مخلوق تھی وہ !!——— سرتاسر حسن کا ایک ایسا مجسمہ جس کی تراش خود حسن کی دیوی نے کی تھی۔ ایک فردوسی حسن کی تصویر کشی ؟——— آہ میرے واسطے یہ ناممکن تھا۔ کیا میں اس کے خوبصورت دانتوں کی زیبائش ظاہر کرنے کے لئے عمیق ترین سمندروں میں غوطہ لگا کر موتی جمع کر سکتا تھا ؟——— کیا اُس کے رنگین رخساروں کو تصویر میں منتقل کرنے کے لئے مجھے شفق شام کی سرخیاں مستعار مل سکتی تھیں ؟ کیا میں ایسے نازک اور زریں تار تیار کر سکتا تھا جو اس کے لہرائے ہوئے بالوں کو ظاہر کر سکتے ؟؟ عناصر فطرت کو مجتمع کر کے اس کی تصویر بنانے کے لئے مجھے یقیناً

"خاتم سلیمانی" کا مالک ہونا چاہئے تھا۔

مصوروں کے رنگ دھندلے ہوتے ہیں اور غیر دلکش —— اس کے ہاتھوں میں نہ استقلال ہوتا ہے نہ نزاکت —— وہ یقیناً اسی دوشیزہ کی کوئی تصویر نہیں تیار کر سکتا جس کا جمال آدمی حدود پر خندہ زن ہو۔ اس کے چہرے کی تابناکی اور دل آویزی بزبان حال گویا تھی کہ وہ اُفق مشرقی کے تالاب میں اس وقت نہا کر آئی ہے۔ جب کہ صبح اور رات ہم آغوش ہوتی ہیں۔ اس کی شفاف اور چاند کو شرمانے والی پیشانی کیوپڈ کی کمان کی طرح خمیدہ تھی۔ اس کے یاقوتی لبوں کی نمود نار گلاب کی جوانیوں سے ہوتی تھی —— اور اس کا متناسب جسم —— آہ وہ تو یاسمین کے پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ تھا جو ابھی ابھی تیار کیا گیا ہو۔

تم دیکھتے ہو وہ سامنے ایک تصویر آویزاں ہے۔ میں نے اسکی تصویر بنانے کی کوشش کی لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایک لاثانی حسین دوشیزہ ہے اور یہ مقدّر ہے کہ تصویر کی صورت میں بھی اُس کا کوئی ثانی پیدا نہ ہوگا —— آہ زندگی کی وہ تازگی —— جوانی کی وہ تبسم آفرینی اور چہرے کی وہ محبت زا دلکشی کاغذ کی مردہ اور بے حس سطح پر منتقل نہ کی جا سکی!!

میں جب کبھی اس کی تصویر بنانے بیٹھتا میرا ہاتھ کانپنے لگتا اور اس کی صورت ——— آہ اسکی صورت — میرے تصور کی گرفت سے نکل نکل جاتی. میں یہ بھول بھول جاتا کہ وہ کیسی معلوم ہوتی تھی ——— اس کی ... اور ناک کے درمیان کیا تناسب تھا ——— اس کی حسین ٹھوڑی کی جسامت کیا تھی ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے اُسے کسی "گردِ بے ہوا" میں دیکھا ہے اور اس لئے کچھ بھی نہیں دیکھا ۔ اس کی تصویر سطح دل سے اس طرح مٹ جاتی گویا تھی ہی نہیں ۔ میرے اِن ہاتھوں نے "التجائے عاجزانہ" جیسی نادر تصویر بنائی اور زرّین تمغہ حاصل کیا — میرے اِن ہاتھوں نے "سن رسیدہ بھکاری کی آخری جھریاں" جیسے لافانی نقش کو تخلیق کیا ——— لیکن میرے یہی ہاتھ اب لرزاں تھے ۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ میری بصارت میں فرق آگیا تھا؟ ——— یا اس لئے کہ خود اس کا شفاف جمال لطیف تھا اور بے رنگ ——— اور اس کی مژگاں میں مادیت کے حدود نہ تھے ——— یا پھر اس لئے کہ اس کا حسن اس قدر خیرہ کُن تھا کہ میری آنکھیں عجز خموش ہو کر رہ گئیں اور میرا دماغ کوئی تاثر قائم نہ رکھ سکا ؟؟؟"

مصوّر بے دم ہو کر بستر پر گر پڑا ۔

"جب بے تاب و پرشوق تصور سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی یہ نہ بتلا سکا کہ وہ کیسی معلوم ہوتی تھی تو میں ایک خواب کی گود میں گر پڑا۔ لیکن پھر بھی جس طرح بچے خواب میں مسکراتے ہیں اور بعض اوقات رونے لگتے ہیں اسی طرح میں بھی خواب میں ہی جاگتا رہا اتنے ہی ہوش و حواس کے ساتھ جیسا کہ سونے سے پہلے تھا"

"طانی"

ڈاکٹر نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن مریض اپنے خیالات میں غرق تھا۔ یکایک اُس نے کہنا شروع کیا:۔

"اس وقت سے مجھے محسوس ہونے لگا کہ دارالعمل میں مجھے دلچسپی حاصل نہیں ہوتی۔ میں گھنٹوں کھڑکی میں بیٹھا رہتا تھا اور جھیل کلنگ کے ارد گرد کے خوبصورت مناظر پر غور و فکر کیا کرتا تھا۔ اواخر جولائی کا واقعہ ہے کہ کھلی ہوئی کھڑکی سے آنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے مجھے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ جس وقت میں گھبرا کر بیدار ہوا تو اندازہ نہ لگا سکا کہ میرے ہوش و حواس پر نیند کتنی دیر مستولی رہی ہے۔ دروازے کھلے ہوئے تھے۔ لیکن کمرے کے اندر کوئی بھی نہ تھا۔ یکایک لباس کی ہلکی سی سرسراہٹ مجھے محسوس ہوئی اور خدا جانے اس میں میری روح نے کیا جاذبیت

پائی کہ میں دروازے میں سے نکلا برآمدے کو طے کیا اور پھاٹک پر پہنچ گیا۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا اور سبزہ زاروں میں ایک طوفان نور برپا تھا۔ سیاہ سایوں کے سامنے چمکتی ہوئی چیزیں نہایت سُبک نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے میں نے دیکھا کہ کوئی چیز جھیل کلنگ کی طرف جا رہی تھی۔ میں ایک ہی منٹ میں جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ لیکن وہاں کچھ نہ تھا سوائے لہروں کے کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔

سفید بادل کے ٹکڑے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ باہم ملتے اور مل کر ایک بن جاتے —— کبھی کبھی کوئی شریر لکّہ ابر چاند کے چہرے پر ایک ہلکی سی نقاب ڈال دیتا اور مسکراتا ہوا اڑ جاتا۔ ستاروں کی آنکھوں میں خاموش قہقہے چمک رہے تھے۔ ہوا کی موجیں اس قدر فرحت ناک اور عطر بیز تھیں اور منظر اس قدر خاموش و سکون آفریں تھا کہ میں بے اختیار ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ مشکل سے پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ میں نے اپنی نگاہوں کو جھیل کی تابناک سطح پر مرکوز اور خود کو ایک مدہوشانہ خواب میں ڈوبتے ہوئے محسوس کیا —— مجھے ایک شکل نظر آئی —— اسی دوشیزہ کی شکل جسے میں پندرہ دن پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں سایہ میں چمک رہی تھیں اس کا چہرہ چاند کی طرح درخشاں تھا —— وہ اُسی تبسم برلب انداز سے میری طرف آ رہی

تھی میں اٹھا اُسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں محبوس کرنے کے لئے ــــ لیکن میری گرفت میں کچھ بھی نہ آیا ــــ وہ غائب ہو چکی تھی صرف جھیل میں چاند کے ضو فشاں عکس کے گرد چھوٹی چھوٹی موجیں رقص کر رہی تھیں میں نے غلطی سے چاند کو اس کا چہرہ۔ لہروں کو اس کا تبسم اور موج صبا کو اس کا لطیف تنفس سمجھ لیا تھا۔

(۴)

"درختوں کے نزدیک سے وہ اپنی کشتی کھیتا ہوا گذرے گا

ــــ ہنستا ہوا نفرت سے ــــ غرق اپنے خیالات

سفر میں ــــ سرگرداں ــــ غمزدہ و زرد رُو

بیکسوں کی طرح!! ــــ مجروح افکار ــــ ہوش باختہ

ــــ ناکام محبت!!"

"گرے"

ڈاکٹر کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دلچسپی محسوس کر رہا ہے اُس نے دوا کی تازہ خوراک مریض کو دی۔ مصوّر کچھ دیر تک کھانستا رہا پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں اور تکیہ پر اپنا سر رکھ کر بے اختیار لیٹ گیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا ــــ "لیکن تم اس جلتے ہوئے بخار اور اس لرزہ کا شکار کیسے ہوئے ہو؟" مصوّر نے چونک کر اپنی آنکھیں اٹھائیں اور بولا

"اس واقعہ کا جو کچھ اثر مجھ پر ہوا اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔ دارالعمل کے کاموں میں جو کچھ دلچسپی باقی رہ گئی تھی وہ بھی ضائع ہو گئی۔ دو مہینے گذر گئے اور میں بدستور اپنے خیالات میں غرق رہا۔ لوگ کہتے تھے کہ مصوّر دیوانہ ہو گیا ہے۔ ہاں وہ یہی کہتے تھے مگر دیوانگی کی قیمت سے ناآشنا تھے۔ کس قدر سکون و مسرت ہے دیوانگی میں! دیوانگی دوسرا نام ہے جمالیاتی نشاط کا دیوانگی ایک دوسرا لفظ ہے فطری مسرت کے لئے۔ دیوانگی وہ ہے جب جذبات ہی جذبات ہوں۔ نہ عقل نہ زندگی نہ دُنیا!!

ایک شام میں غیر متوقع طور پر اور پوشیدہ طریقے سے اپنے مکان سے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں ایک اونچے ٹیلے پر پہنچا جس کے نیچے میری نگاہوں کے سامنے حسین منظر پھیلا ہوا تھا۔ موسم صاف نہ تھا۔ سفید و سیاہ بادل آسمان پر جمع ہو رہے تھے۔ میری نگہ ایک ایسے سفید بادل پر جمی ہوئی تھی جس کے کناروں پر بادامی رنگ کی دھاری پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بادل پھیل رہا تھا۔ یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے تمام منظر گھوم رہا ہے۔ روشنی پر تاریکی محیط ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک دوسری دنیا میں منتقل کر دیا گیا ہوں اور میرے پاؤں کے نیچے پتھریلی زمین ہے۔ مجھے سامنے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ اور سرد ہوا محسوس ہوتی تھی۔ میں سخت زمین پر چلا جا رہا تھا کہ یکایک

داہنے ہاتھ کو مڑا تو دیکھا کہ وہی دوشیزہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھی ہے وہ رو رہی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور اس کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رونے کی وجہ دریافت کی ——— اُس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا صرف ایک بڑا سا آنسو اس کی آنکھوں میں ظاہر ہوا جو کچھ دیر اس کی پلکوں پر کانپ کر میرے ہاتھ کی پشت پر گر پڑا۔ قطرے کے التہاب نے مجھے چونکا دیا۔

بارش کے بڑے بڑے قطرے گر رہے تھے اور لوگ پناہ کے واسطے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ ٹیلے سے نیچے اُترا اور دکان کی طرف روانہ ہوگیا۔ بعد کے واقعات کا مجھے ہوش نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں پوری طرح بارش میں بھیگ گیا تھا اور راستے میں ہی بیہوش ہوگیا تھا ——— اور یہ کہ میرے تپ و لرزہ کا یہی سبب ہے۔

"تو تم اس سے محبت کرتے تھے دیوانہ وار"؟ ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں مجھے اُس سے محبت نہیں تھی ——— مجھے اُس کے "حسن" سے محبت تھی اُس کی "ذات" سے نہیں ——— آپ ایک خوبصورت تصویر سے محبت کرتے ہیں نہ کہ اُس تصویر کے کاغذ سے!!

یاد رکھئے مصور حسن کا عاشق ہے ——— صرف "حسن" کا ——— خواہ وہ حسن پہاڑی وادیوں اور سنگین چٹانوں میں ہو یا موسلا دھار

بارش اور بادلوں کی سماعت شکن و ہیبت ناک گرج میں ـــــ خواہ وہ اس آہستہ آہستہ بہنے والے چشمے میں ہو جس کو ڈوبتے سورج کی کرنوں نے پگھلے ہوئے سونے میں تبدیل کر دیا ہے یا کسی زندہ مخلوق کی معصومیت میں!! ـــــ مصوّر حسن کے لئے جیتا ہے اور حسن کے لئے مرتا ہے۔ مجھے اس کی فانی اور انسانی ذات سے محبت نہ تھی بلکہ اُس "جمالِ لانہایت" کی طلب تھی جو اُس کے گوشت و پوست میں محیط تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس حُسن کو چُراؤں اور لافانی تصاویر میں محفوظ کر دوں ـــــ"

"دوا کی خوراک نے شاید اثر کیا ہے" ڈاکٹر نے کہا اور تھرمامیٹر لگانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

مصوّر کا چہرہ سُرخ و درخشاں ہو گیا تھا۔ اس کا "انجام" قریب آ رہا تھا۔ اس کی تقریر میں ایک قسم کی دیوانگی اور بے پناہ مسرت جھلک رہی تھی۔ وہ بولا ـــــ "تم میری نبض کی جنبشوں کو شمار کر سکتے ہو لیکن میرے جسم کے اندر میری روح کے اضطراب کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اپنے تھرمامیٹر سے تم میرے درجۂ حرارت کا علم حاصل کر سکتے ہو مگر محبت کے التہاب سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ تم ایک جسم کو جو مرئی اسباب کی بنا پر تکلیف میں مبتلا ہے۔ شفا دے سکتے ہو لیکن

روح کا روگ تمہارے بس کی بات نہیں ——— یہ روگ تکلیف کے بجائے راحت دیتا ہے ——— دماغ کو ضعیف کرنے کے بجائے روشن کرتا ہے اور ———" یکایک مصوّر کی زبان ساکت ہوگئی اس کی روح پرواز کر چکی تھی!! ———"قلبی حرکت بند ہوگئی" ڈاکٹر نے زیرِ لب کہا۔ اور چل دیا۔

(ترجمہ)

دُختر زبدا

دریائے زبدا کی بل کھاتی ہوئی موجوں کے آغوش میں ننھے سے جزیرے کی طرح ایک مرمریں چبوترہ قائم تھا اور شیلا اس حسین مرتفع سطح کے کنارے بیٹھی تھی، پس منظر ایک سنگین زینہ تھا جس کی سیڑھیاں دریا سے نکل کر چبوترے کے دوسرے کنارے تک آتی تھیں ——— اور دریا کے اس پار ——— گھنے درختوں کے درمیان ایک تنہا مندر۔ شیلا کا چہرہ نوجوان چاند کی چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اس کی ساری قوس قزح کی مست رنگینیوں کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی تھی، اس کے برہنہ سیمیں پاؤں پانی کی نازک نازک لہروں میں لہرا کر خود بھی ایک نازک لہر بن گئے تھے ——— اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود ایک انسانی ہستی نہیں بلکہ کوئی سماوی مخلوق ہے۔ یا پھر ایک بنت البحر ——— اس کی بڑی بڑی

آنکھیں بادلوں کے ان ٹکڑوں پر مرکوز تھیں جو شفق شام کی رنگ کاریوں سے گلنار بن گئے تھے۔ اس کا ستار کسی برہ کی ستائی ہوئی بیوگنی کی طرح گنگنا رہا تھا، اور اس کے نغموں میں ایک نامعلوم روحانی تشنگی تڑپ رہی تھی۔

"آہ کہاں ہو تم!" اس نے ایک طویل سرد آہ کے ساتھ دہرایا۔

"پریتم! آہ کہاں ہو تم!"

"گوکل کے میدانوں میں اور بندرابن کے دامن میں
کرشن جہاں بنسی کی لے سے ہوک اٹھاتے تھے دامن میں
جنگل جنگل بستی بستی
ڈھونڈھ پھری میں ڈھونڈھ پھری
پریتم!
آہ کہاں ہو تم!
شیلا کے من کو جو پیارے کویل کے پر مل جاتے
شیلا کے جو پریم کو پریتم! تم اڑنا سکھلا جاتے
بادل بادل تارہ تارہ
چھانتی پھرتی اڑ اڑ کر
پریتم!
آہ کہاں ہو تم!"

بوڑھا پجاری جو زینے پر استادہ تھا۔ جذبات کے اسی طوفان میں کانپ رہا تھا۔

پریم سنگھ ـــــ ایک نوجوان لفٹنٹ ـــــ نے اپنی کشتی سے باہر قدم رکھا، جو اس نے شیلا کی نشست کے پیچھے نہایت خاموشی سے روک دی تھی۔ وہ آگے بڑھا، اس تمام احترام و تکریم کے ساتھ جس کا اظہار صرف ایک دیوی کے حضور میں کیا جا سکتا ہے۔ آگے بڑھا، اور وہ سارے پھول جو مندر کی سنگین و بے زبان دیوی پر نچھاور کرنے لایا تھا۔ شیلا کے سامنے پیش کر دیئے۔ شیلا نے ایک لمحہ کے لئے اس خوبصورت نوجوان کی طرف غور سے دیکھا، اور پھر نگاہیں جھکا لیں،

"پھولوں کے اس تحفے کا شکریہ!" اس نے پھولوں پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ اب بھی ایک مرمریں مجسمے کی طرح بحس و حرکت کھڑا تھا۔

"ایک جوگن سے اور کیا چاہتے ہو؟" اس نے اپنی آواز قدرے بلند کرتے ہوئے کہا۔ ہمارے راستے بالکل جداگانہ ہیں پریم! اس دیوی کو فراموش نہ کرو، جس کی پرستش کے لئے تم یہاں آئے ہو۔"

اس نے سر تسلیم خم کیا، اور اپنی کشتی کھیتا ہوا چلا گیا ـــــ شیلا مڑ مڑ کر اس کی چھوٹی سی کشتی کو موجوں پر ہچکولے کھاتے دیکھتی رہی۔ اسے حیرت تھی، کہ نوجوان مندر میں دیوی کے حضور میں حاضر ہوئے بغیر کیوں چلا گیا۔

(۲)

"عورت کیلئے محبت ایک مذہب ہے اور مرد کے لئے تعطل و فرصت کا ایک لذیذ شغل"۔

"لیکن مرد محبّت پر اپنی جان دے دیتا ہے"۔

"ہاں — مگر محبت میں زندہ رہنا مرنے سے دشوار ہے۔ اور عورت زندہ رہتی ہے"۔

"محبت کا جاں ستاں زخم عورت ہی کی بیدردی کا نتیجہ ہوتا ہے"۔

"خوب! — ابھی تک کیوپڈ کو خود اپنی جنس کا علم نہیں؟"

شیلا اور پریم سنگھ "غلطاں باغات" سے نیچے اتر رہے تھے۔ اور خوش طبعی کے ساتھ بحث و تمحیص میں مشغول تھے۔ پریم کو اعتراف کرنا پڑا، کہ وہ محض ایک سپاہی ہے، اور بحث و مباحثہ اس کی قدرت سے بعید!

چلتے چلتے دونوں ایک گلپوش کے گرد گھومے تو شیلا نے ایک پھول توڑا، اور پریم کے کوٹ میں لگانے لگی۔

پریم نے ایک بے پناہ جاذبیت سے مجبور ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا، اور اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اپنی نظریں غرق کر دیں

"اسرار کے ان دو سیاہ سمندروں نے میرے دل کو تباہ کر دیا ہے۔ ناقابلِ فہم ذہنیت کی شہزادی ـــــ شیلا! میری قسمت کا فیصلہ ایک بار ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں کر دیتی ہو؟"

"ہمارے درمیان ایک شفیق باپ کی ہستی حائل ہے۔ جس کا میرے علاوہ دنیا میں کوئی نہیں، تمہاری ٹرین کو قلابہ اسٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اس نے مجھ سے اپنی یہ تمنا ظاہر کی تھی، کہ اپنی ذات اور نسب کے وقار و احترام کو فراموش نہ کرنا۔"

"آہ! ـــــ پھر وہی رسوم و روایات کی لعنت! ـــــ اور ہاں شاید تمہارا لکھ پتی باپ یہ بھی تو خیال کرتا ہوگا کہ پریم سنگھ اس قدر دولت مند نہیں، کہ تمہارے لئے منتخب کیا جائے۔"

"اس کی شرافت و عظمت پر حملے نہ کیجئے ـــــ تم دونوں میرے واسطے بیش قیمت ہو، میری آنکھوں کی طرح ـــــ میں کسی ایک سے بھی جدا نہیں ہو سکتی۔"

"پھر اس چیستاں کو کیسے حل کرو گی تم؟"

"حل ہو جانے کے بعد چیستاں کی دلکشی فنا ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"پریم کی آگ میں گھل گھل کر ختم ہو جانا۔"

جذبات سے مغلوب ہو کر پریم نے سشیلا کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا لیکن سشیلا فوراً ہی بجلی کی طرح تڑپ کر آزاد ہو گئی۔ اور شدتِ احساس سے کانپنے لگی...... پریم نے عفو نوازی کی التجا کی — سشیلا رونے لگی — سسکیاں لے کر — وہ زبان سے کیا کہتی؟

(۳)

پریم سنگھ اور ننسی پیرس کے ایک "نشاط خانے" کے عقبی گوشے میں بیٹھے تھے۔ اور ہر اس شغل میں جذب تھے جو "شراب و حسن و شباب" کے تصادم سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ننسی کی آنکھیں فسوں کار تھیں، اور اس کے لمبے لمبے بال میخانہ بدوش کالی گھٹائیں — اس لئے اگر پریم سنگھ جوشِ محبت میں اسے "یونان کی حسین پری" کہہ رہا تھا۔ تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ دو بار تو ایسا ہوا کہ ہیجانِ جذبات سے بے قابو ہو کر اس نے اٹھ کر ننسی کی آنکھوں سے اپنے مرتعش لب وصل کر دیئے۔ اور اکثر ایسا ہوا کہ لبریز جامِ شراب کو ننسی کے گرد طواف دے کر اس نے ایک سانس میں خالی کر دیا — ننسی کی آنکھوں میں محبت حکمراں تھی اور وہ تمام فرانسیسی لوگ جو آس پاس بیٹھے تھے۔ اس خیال سے مسکرا رہے تھے کہ ایک

ہندوستانی نوجوان معاملاتِ عشق میں بھی اتنا ہی کاہل ہوتا ہے۔ جتنا کہ ہنگامہ کارزار میں!

آخر کار وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل کے خادم نے پریم سنگھ کو بتایا، کہ اس کا بل ایک حسین لڑکی نے ادا کر دیا ہے۔ جو نیم مشرقی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے دروازہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"وہ ـــ سامنے جا رہی ہے وہ لڑکی!"

پریم سنگھ تڑپ کر باہر سڑک پر پہنچا ـــ لیکن ٹیکسی روانہ ہو چکی تھی، اس لڑکی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ـــ اس نے چلا کر پکارا ـــ "شیلا!!" اور لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا۔

(۴)

دریا کے وسط میں ایک مرمریں چبوترے پر ایک بنت البحر بیٹھی تھی، لوگ اُسے "دخترِ نربدا" کہتے تھے۔ اس کے عارضوں کے گلاب مرجھا گئے تھے۔ اس کے لباس پر قوس و قزح کی رنگینیاں باقی نہ رہی تھیں ـــ اس کے چہرے کا رنگ ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا کسی نے یاسمین کے پھولوں میں زعفران کی لہریں دوڑا دی ہیں ـــ اور ـــ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی بجلیاں بجھتی ہوئی شمع کی زرد کرنوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔

اس نے اپنی خوابناک نگاہیں منظر پر دوڑائیں، اور اپنا ستار اُٹھایا

جو اس کے پہلو میں خاموش پڑا تھا۔ ستار کے تاروں سے نرم نرم شیریں جھنکار پیدا ہوئی، اور ذرا سی دیر میں شیریں نغموں کے ایک ابلتے ہوئے چشمے میں تبدیل ہو گئی۔ ایک مجبور و شکستہ تبسم جو سوز و الم سے نیم جاں معلوم ہوتا تھا، اس کے لبوں کے گوشوں پر نمودار ہوا۔ رفتہ رفتہ اسکی آنکھوں میں سکر و سرور کی ایسی کیفیات ظاہر ہو گئیں جیسے کسی نے صرف نصف جام پی کر رکھ دیا ہو۔ اور اس کے چہرے پہ ایک ہلکی سی سرخی مجتمع ہونے لگی اس کا نغمہ شیریں تھا — اس کا موضوع نغمہ شیریں تر:—

"نہیں!" اس نے اپنا ترانۂ مسرت شروع کیا "نہیں۔ تم وہاں نہیں ہو!"۔

ان حسین بستیوں میں جو ہیں بادلوں سے آگے
نہیں
تم وہاں نہیں ہو
مہ و مہر میں نہیں ہے رخِ پُر ضیا تمہارا
نہیں کہکشاؤں میں بھی کوئی نقشِ پا تمہارا
یہ فضا کے خالی دامن ہیں ہوا کے خالی دامن
مرے شوق کی نظر نے یہ حجاب دیکھ ڈالے
نہیں
تم وہاں نہیں ہو

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی، اور پھر گانے لگی:—

کہیں فطرتِ حسیں میں تو چھپے ہوئے نہیں ہو؟
نہیں! ورنہ یوں نہ رہتے یہ جہاں کی نظارے
یہ پپیہا مست ہو کر وہ فنا کے راگ گاتا
کہ تبسم آگ بن کر لبِ گل پہ تھرتھراتا
یہ دھنک کے شوق جلوئے کوئی... ایسا رُخ بدلتے
کہ تمہارا نام جیسے کوئی آسماں پہ لکھ دے
نہیں! تم وہاں نہیں ہو!

وہ پھر ذرا رک گئی۔ اور ستار کے تاروں کو جھنجھنا کر گانا شروع کر دیا:۔

"مگر ہاں! — بسے ہو تم تو میری اجڑی پریت ہی میں
تمہیں پا لیا ہی میں نے۔ تمہیں پا لیا ہی پیارے
یہ مرا فگار پہلو! جو ہے یادگار پہلو
میری ضبط کردہ آہیں جو ہیں شاہکارِ الفت
میری روح روحِ سوزاں میرا قلب قلبِ بریاں
یہ تمہارے واسطے ہے میرا سارا ساز و ساماں
تمہیں پا لیا ہے میں نے۔ تمہیں پا لیا ہی پیارے

سن رسیدہ پجاری کے لبوں سے ایک کراہ بلند ہوئی اور وہ زمین پر گر پڑا!

نثار احمد قریشی

۲ فروری ۸۳ء لاہور

مکتبہ دانش مزنگ لاہور